تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّر قرآن وحدیث

تدبر

سلسلہ نمبر ۱۶ جمادی الاول ۱۴۰۶ھ جنوری ۱۹۸۶ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ آل عمران (۵) ——— خالد مسعود ۹

حکمتِ قرآن

آخرت اور جزا و سزا

فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں (۱) ——— امین احسن اصلاحی/محبوب سبحانی ۱۸

تزکیۂ نفس

آدمی کا تعلق

غرباء و یتامیٰ اور پڑوسیوں سے ——— امین احسن اصلاحی ۳۳

تاریخ و سیر

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بحیثیت تاریخ ساز مدبر ——— امین احسن اصلاحی ۴۰

افاداتِ فراہی

تخلیق اور اس کی غایت ——— خالد مسعود ۴۷

مجلسِ ترتیب :

——— خالد مسعود (مدیر)

——— عبداللہ غلام احمد

——— ماجد خاور

——— محبوب سبحانی

ناشر : ——— ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور - ۲۵

مطبع : ——— المطبعۃ العربیۃ ۔ لاہور

قیمت : ۴/- روپے

خالد مسعود

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت

ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت کا تختہ الٹ کر جب آیت اللہ خمینی برسر اقتدار آئے تو پریس نے ان کی تحریک کو پاکستان کی اس ہم عصر تحریکِ نظامِ مصطفےٰ کے مماثل قرار دیا جس نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو وزارتِ عظمیٰ سے محروم کیا اور ملک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق دینی حکومت قائم کرنے کا نعرہ لگایا تھا۔ لہٰذا پاکستان میں انقلابِ ایران سے یہ توقع پیدا ہو گئی کہ وہاں خالص اسلام کے نفاذ کے لیے سازگار حالات پیدا ہو جائیں گے کیونکہ تمام اقتدار کلیتہً علماء کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ اس توقع کے پیدا کرنے میں جماعت اسلامی کا خاص طور پر بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے انقلابِ ایران کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ انقلاب کے قائدین کو مبارک باد دینے کے لیے اپنے صفِ اوّل کے لیڈروں پر مشتمل وفود بھیجے۔ ان وفود نے اپنے بیانات اور رپورٹوں میں ان قائدین کی کامیابی کو اسلام کی کامیابی قرار دیا اور نئی حکومت کے بارے میں کچھ ایسا تاثر دیا، جیسے وہ آیت اللہ خمینی کی زیرِ نگرانی خلافتِ راشدہ کے طرز کی حقیقی اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو۔ چنانچہ پاکستان کے عوام کی نگاہیں ایران کی طرف اٹھنے لگیں کہ شاید اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا خواب اسی سرزمین سے شرمندۂ تعبیر ہونے والا ہے۔

انقلاب کے کچھ عرصہ بعد حکومتِ ایران کے طرزِ عمل سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ نہایت متعصب شیعی حکومت ہے جو اپنے مخالفوں کو کچل دینے پر یقین رکھتی ہے۔ اس نے سنی اکثریت کے علاقے پر باقاعدہ چڑھائی کر دی ہے اور قتل و نہب کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض واقف کاروں نے یہ انکشاف کیا کہ 'آیت اللہ' اور 'روح اللہ' جیسے القاب شیعہ مسلک کے ائمہ کے مناصب کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بعض مذہبی معتقدات وابستہ ہیں۔ ایرانی حکومت کی دعوت پر جانے والے بعض وفود کے ارکان نے بھی یہ رپورٹ دی کہ وہاں حکومت کی سرپرستی میں شیعیت کے نفاذ کی بھرپور مہم جاری

ہے اور سنیوں پر سختی کی جارہی ہے تب جاکر اس نام نہاد اسلامی انقلاب کی حقیقت لوگوں پر کھلی اور انہیں مزید حالات جاننے کی جستجو ہوئی۔ چنانچہ اب تک بعض آنکھیں کھول دینے والی تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ نے بھی امتِ مسلمہ کو اس شیعی انقلاب کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے تین سو صفحات کی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام 'ایرانی انقلاب' امام خمینی اور شیعیت' ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں تین موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ اول ایرانی انقلاب کی صحیح نوعیت۔ دوم آیت اللہ خمینی کے عقائد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے بارے میں ان کے خیالات اور فقہی آراء۔ سوم شیعیت کی حقیقت اور اثنا عشری شیعہ جو دوسرے شیعہ فرقوں کی نسبت معتدل قرار دیے جاتے ہیں، کے معتقدات۔ مولانا نے ان تین عنوانات کو اس لیے جمع کیا ہے کہ ان کے نزدیک انقلابِ ایران کی ایک مذہبی بنیاد ہے اور شیعہ مذہب کی حقیقت کو جانے بغیر انقلاب کی نوعیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سنی مسلک کے لوگ عام طور پر شیعی نقطہ نظر سے واقفیت نہیں رکھتے۔ نہ ان کی بنیادی کتب تک ان کی رسائی ہوتی ہے اور نہ وہ ان کا مطالعہ کرپاتے ہیں۔ چنانچہ وہ شیعہ کو بھی محض ایک فقہی مسلک قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لیے مولانا نے اس مذہب کو مفصل بیان کیا ہے۔

مولانا کی تحقیق میں شیعیت کا اولین مصنف یمن کا ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا تھا جس نے سیدنا عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا لیکن پس پردہ اس کا منصوبہ اسلام اور مسلمانوں کو اسی طرح کا نقصان پہنچانا تھا جس طرح کا نقصان سینٹ پال نے عیسائیت اور نصاریٰ کو پہنچایا تھا۔ اس نے زیرِ زمین ایک تحریک چلا کر سادہ لوح عوام کے اندر اس طرح کے خیالات پھیلانے شروع کیے کہ حضرت علیؓ نبوت و رسالت کے حقیقی اہل تھے اور فی الحقیقت جبریلؑ کو بھیجا بھی انہی کے پاس گیا تھا لیکن وہ محمدؐ کے پاس جا پہنچے اور وحی ان کے حوالے کردی۔ حضرت علیؓ کے قالب میں خداوندی روح تھی۔ رسول اللہؐ کے بعد ان کی نیابت کا حق حضرت علیؓ کا تھا۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے جو اس کے بعد امت کا سربراہ بنتا ہے۔ آنحضرتؐ کے وصی علیؓ تھے اور خلافت ان کا حق تھا جس کو منافقین نے سازش کرکے غصب کرلیا۔ وغیرہ۔ ان خیالات کو خفیہ طور پر پھیلایا گیا اور جتنا جتنا کسی نے قبول کیا اسی پر اکتفا کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کے مختلف فرقوں میں آگے چل کر اپنے عقائد کے بیان میں اختلاف پیدا ہوگیا لیکن جو چیز ان سب میں مشترک نظر آتی ہے وہ ہے حضرت علیؓ کے بارے میں غلو اور صحابہ کرامؓ بشمول خلفائے راشدینؓ اور امہات المومنینؓ کے لیے عناد۔

مولانا کی تحقیق میں شیعیت کا بنیادی عقیدہ امامت کا ہے، باقی عقائد اسی کے فروع ہیں۔ شیعہ کے نزدیک

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت اور سربراہی کے لیے امامت کا ایک سلسلہ قائم کیا اور بارہ امام مبعوث کیے جو امامِ اول حضرت علیؓ کی نسل سے تھے۔ یہ امام اللہ کی حجت اور معصوم عن الخطا تھے۔ یہ صاحبِ معجزات تھے۔ ان کے پاس ملائکہ آتے، ان کو معراج ہوتی۔ کائنات کے ذرے ذرے پر ان کی حکومت تھی، وہ دنیا اور آخرت کے مالک تھے، وہ ماضی اور مستقبل کے احوال کا علم رکھتے تھے، دنیا انہی کے دم سے قائم ہے۔ وہ بندوں میں سے جس کو چاہیں عطا کریں اور جس کو چاہیں محروم رکھیں۔ ان پر اللہ کی طرف سے کتابیں نازل ہوتی تھیں اور ان کو اختیار تھا کہ جس چیز یا عمل کو چاہیں حلال یا حرام قرار دے دیں۔ یہ تمام امام درجہ میں رسول اللہؐ کے ہم پلہ اور دوسرے تمام انبیاء سے افضل و برتر تھے۔ ان کی امامت کو ماننا اور ان پر ایمان لانا شرطِ نجات ہے۔

شیعہ کے عقیدہ کے مطابق گیارہ امام یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے اور لوگوں کے درمیان رہے۔ لیکن بارہویں امام جن کو امامِ غائب، مہدی، الحجۃ، القائم، المنتظر اور صاحب الزمان کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ولادت کے بعد سے ہی مستور رہے اور اپنے والد امام حسن عسکری کی وفات سے دس دن پہلے معجزانہ طور پر غائب ہو کر ایک غار سر من رای میں چلے گئے۔ ساٹھ ستر برس تک انہوں نے وہاں سے شیعوں کے ساتھ اپنا تعلق چند خاص افراد کے ذریعے رکھا، ان کی معرفت لوگوں کے ہدایا و تحائف وصول کرتے رہے اور اپنے متبعین کو ہدایات دیتے رہے۔ یہ زمانہ ان کی غیبتِ صغریٰ یعنی چھوٹی غیر حاضری کا کہلاتا ہے۔ اس مدت کے بعد ان کے ساتھ مخصوص افراد کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا لہٰذا شیعہ ان کی ہدایات سے محروم ہوگئے۔ اس دور پر اب گیارہویں صدی جارہی ہے۔ یہ امام کی غیبتِ کبریٰ یعنی بڑی غیر حاضری کا زمانہ ہے۔ شیعہ ان کی آمد اور ظہور کی دعائیں کرتے ہیں اور اس پورے عرصے میں ان کے منتظر رہے ہیں۔

امامِ غائب کے ظہور کے ساتھ شیعہ کی بڑی توقعات وابستہ ہیں کیونکہ جب وہ ظاہر ہوں گے تو پوری دنیا میں ان کی حکومت قائم ہوجائے گی اور ان کے مخالفین کا قلع قمع کردیا جائے گا۔ اہلِ سنت کے نقطہ نظر سے امامِ غائب کے ظہور کے ساتھ بڑی ناگفتنی باتیں بھی وابستہ ہیں مثلاً ان کی آمد پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بیعت کرنی پڑے گی۔ وہ اہلِ بیت کے مخالفین کو زندہ کرکے سزائیں دیں گے۔ پہلے تین خلفائے راشدینؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ پر ان کا غضب خاص طور پر ظاہر ہوگا اور وہ ان سے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کا انتقام لیں گے۔ اس مقصد سے سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا عمرؓ کی قبروں کو کھودا جائے گا۔ لاشوں کو زندہ کرکے ان کو ہر اس گناہ کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا جو امامِ غائب کے ظہور تک دنیا کی پشت پر ہوا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انہوں نے امام علی کی خلافت کا حق غصب کرلیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو دنیا میں کوئی گناہ نہ ہوتا۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں دن رات میں ہزار مرتبہ ان کو مار ڈالا جائے گا اور پھر زندہ کیا جائے گا۔ امام کی حکومت میں سنیوں اور خاص طور پر ان کے عالموں کو

نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

شیعہ کے نزدیک سیدنا ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمان غنیؓ نیز صحابہ کرامؓ بالعموم کافر و مرتد ہیں کیونکہ انہوں نے پہلے امام علیؓ کی ولایت و امامت کا حق نہ پہچانا۔ یہ تمام صحابہ باستثنائے حضرت عمار بن یاسرؓ، مقداد بن الاسودؓ، ابو ذر غفاریؓ اور سلمان فارسیؓ گمراہ اور کافر تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہوں نے حضورؐ کا ساتھ منافقانہ دیا اور بعد میں ان کا نفاق اور کفر کھل کر سامنے آگیا۔ اسی لیے شیعہ ان پر سب و شتم کو جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔

مولانا نے شیعہ مذہب کی اصولی تعلیمات میں کتمان اور تقیہ کا حکم بھی بتایا ہے۔ کتمان سے مراد اپنے اصل عقیدہ اور مذہب و مسلک کو چھپانا اور دوسروں پر ظاہر نہ کرنا ہے۔ تقیہ کا مطلب ہے اپنے قول یا عمل سے واقعہ اور حقیقت کے خلاف یا اپنے عقیدہ و ضمیر اور مذہب و مسلک کے خلاف ظاہر کرنا تاکہ سننے یا دیکھنے والا دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو جائے۔ مولانا کی تحقیق میں یہ عقیدے اثنا عشری مذہب کی تصنیف کے وقت اس ضرورت کے تحت ایجاد کیے گئے کہ جن ابتدائی اماموں کو امامت کے منصب پر فائز بتایا گیا انہوں نے خود کبھی امامت کا دعویٰ نہ کیا تھا بلکہ وہ خود خلفائے راشدینؓ، خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس کے ہاتھوں پر بیعت کرتے رہے۔ چونکہ ان کا یہ عمل مسئلہ امامت کے بے بنیاد و بے اصل ہونے کی ایک روشن واقعاتی شہادت تھا اس لیے یہ عقیدہ بنایا گیا کہ یہ ائمہ اس لیے خاموش رہے کہ مذہب کی اساس کتمان و تقیہ پر ہے۔

شیعہ کے نزدیک تقیہ ترک کرنے والا تارکِ نماز کی طرح ہے۔ شیعہ امام تقیہ کرتے ہوئے بسا اوقات حرام کو حلال بھی بتا دیتے، ایک ہی دینی مسئلہ میں مختلف لوگوں کو مختلف جوابات دیتے اور مخالفین کی نماز جنازہ پڑھتے تو اس میں مغفرت کی دعا کے بجائے لعنت و عذاب کی بددعا کرنے میں کوئی قباحت نہ سمجھتے۔

قرآن مجید میں امامت کے عقیدہ کا کوئی خفیف سے خفیف اشارہ تک نہیں پایا جاتا، اور شیعہ کے نزدیک یہ ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنے اہم عقیدہ کا ذکر قرآن نے کیوں نہیں کیا۔ اس کا جواب شیعہ یہ دیتے ہیں کہ قرآن کو مرتب کرنے والے صحابہ نے امامت کی تمام آیتیں اس میں سے نکال دی تھیں۔ قرآن کے اندر بھی اسی طرح کی تحریف ہوگئی جیسی تحریف تورات اور انجیل میں ہوئی ہے۔ اصل قرآن امام علیؓ نے اپنے بعد آنے والے اماموں کے حوالے کیا۔ وہ اسے سینے سے لگائے رہے اور اپنے بعد کے نامزد امام کے حوالے کرتے رہے تاآنکہ امام غائب اسے غار سُرَّ مَن رَأیٰ میں لے گئے۔ وہ اپنی آمد کے وقت اسے ساتھ لائیں گے۔

جہاں تک ایرانی انقلاب کا تعلق ہے مولانا کی تحقیق میں یہ انہی شیعی معتقدات پر مبنی ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ آیت اللہ خمینی نے ان کو اپنی کتابوں میں پوری قوت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو یہ نیا فلسفہ بھی دیا ہے کہ امام غائب کی غیبت کبریٰ کے زمانے میں شیعہ مجتہدین اور فقہا کا یہ فرض ہے کہ امام آخر الزمان کے

نائب اور قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لینے کی جدوجہد کریں۔ ان کے اپنے الفاظ میں "جب کوئی فقیہ جو صاحبِ علم ہو، عادل ہو اور حکومت کی تشکیل و تنظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس کو معاشرے کے معاملات میں وہ سارے اختیارات حاصل ہوں گے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھے اور سب لوگوں پر اس کی سمع و طاعت واجب ہوگی۔ یہ صاحبِ حکومت فقیہ و مجتہد حکومتی نظام، عوامی و سماجی مسائل کی نگہداشت اور سیاست کے معاملات میں اسی طرح مالک و مختار ہوگا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام مالک و مختار تھے"۔ ...... "فقہاء ائمہ معصومین کے بعد اور ان کی غیبت کے زمانہ میں رسولؐ کے وصی ہیں اور وہ ان سب امور و معاملات کی انجام دہی کے مکلف ہیں جن کی انجام دہی کے مکلف ائمہ تھے"۔ اس نظریہ کی رو سے خمینی امام غائب کے قائم مقام، رسول اللہ کے وصی اور امام اور نبیؐ کی طرح واجب الاطاعت ہیں۔ ان کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ وہ پورے عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کو اپنے زیرنگیں لانے کی جدوجہد کریں اور اس میں شیعیت کو رواج دیں اور ان کی اس جدوجہد میں کوئی شخص یا ریاست رکاوٹ بنے تو اس کا قلع قمع کرنے کی ہر ممکن شکل اختیار کریں۔

مولانا نعمانی نے آیت اللہ خمینی اور شیعیت کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ آیت اللہ خمینی کی تین کتابیں —— الحکومۃ الاسلامیہ، تحریر الوسیلہ اور کشف الاسرار —— ان کے پیش نظر رہی ہیں۔ شیعہ مذہب کے بارے میں معلومات اس مذہب کے سب سے معتبر علماء کی کتابوں —— اصول کافی، فروع کافی، حق الیقین، فصل الخطاب، احتجاج طبرسی وغیرہ —— سے حاصل کی ہیں۔ انہوں نے نہایت فراخ دلی سے طویل اقتباسات نقل کر دیے ہیں تاکہ ہر بات شیعہ مصنفین کے اپنے الفاظ میں قاری کے سامنے آجائے۔ مولانا نے اپنی تصنیف کو ایک معلوماتی کتاب بنایا ہے اور جو خیالات اس میں نقل کیے ہیں ان پر تنقید سے ہر جگہ گریز کیا ہے۔ بس کہیں کہیں مجمل طور پر وہ چند اختلافی سطور لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ میں یہ کتاب ایرانی انقلاب اور شیعیت کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے لکھ رہا ہوں تاکہ اہل سنت اور اہل علم و دانش اس سے واقف ہو جائیں، اس پر تنقید کتاب کا موضوع نہیں ہے۔

مولانا کے اس نقطہ نظر کی وجہ سے کتاب یک طرفہ خیالات کا ایک ذخیرہ تو بے شک بن گئی ہے لیکن اس کے نتیجہ میں ایک بڑی مصلحت نظر انداز ہوگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل سنت کی بہت بڑی تعداد شیعی پروپیگنڈہ کا شکار ہو چکی ہے۔ یہ لوگ اہل بیت انہی افراد کو سمجھتے ہیں جن پر شیعہ اہل بیت ہونے کا اطلاق کرتے ہیں اور پھر صحابہ کرامؓ سے الگ ان کی اسی طرح کی خصوصی حیثیت مانتے ہیں جیسی شیعہ بتاتے ہیں۔ اماموں پر نہ صرف ان کا عقیدہ ہے بلکہ ان کے نام کی نیاز بھی دیتے ہیں اور اگر ان کے نام پر کوئی نئی بدعت

جاری کر دی جائے تو اس میں پورا پورا حصہ لیتے ہیں۔ تفضیلِ علیؓ و حسنینؓ کے قائل آپ کو اہلِ سنت میں بھی ملیں گے۔ ان کا ایک بہت بڑا حصہ جو تصوف کا قائل ہے دوسرے صحابہ کرامؓ کو چھوڑ کر اپنا ہادی و مرشد صرف حضرت علیؓ ہی کو مانتا ہے۔ امام مہدی کے منتظر شیعہ ہی نہیں بلکہ سنی علماء تک بھی ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھیے تو بیسیوں روایتیں نقل کر کے آپ کو اس بات کا قائل کرتے نظر آئیں گے کہ امام مہدی کی آمد پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس لیے ہمارا گمان یہ ہے کہ بہت سے اہلِ سنت کتاب کے اکثر مندرجات میں کوئی اجنبیت نہیں پائیں گے۔ وہ اس کو پڑھ کر یہ سوچیں گے کہ یہ باتیں تو ہم بھی مانتے ہیں۔ اگر شیعہ بھی ان کو مانتے ہیں تو ٹھیک تو مانتے ہیں۔ مولانا کو اہلِ سنت سے یہ خوش گمانی رہی ہے کہ وہ اپنے دین سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور شیعی معتقدات سے متاثر نہیں۔ اس خوش گمانی کے نتیجہ میں کتاب ادھوری رہ گئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اس صورت میں کہیں زیادہ مفید ہو سکتی تھی جب ہر شیعی نقطہ نظر کے پہلو بہ پہلو اہلِ سنت کا صحیح علمی نقطہ نظر مدلل طریقہ سے آ جاتا۔ اس صورت میں ہمارے عوام و خواص کو معلوم ہو سکتا کہ وہ شیعی دامِ تزویر میں کس بری طرح آ چکے ہیں۔

پاکستان میں یہ کتاب عمران اکیڈمی ۳۰ بی اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کی قیمت کہیں درج نہیں۔

بقیہ : سورہ آلِ عمران (۵)

از ص۹

ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے ۞ یہ وہ ہیں کہ جن کو لوگوں نے سنایا کہ دشمن نے تمہارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو، تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا[۱۲۳] اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے ۞ سو یہ لوگ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے، ان کو ذرا گزند نہ پہنچا، اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۞ یہ شیطان ہے جو اپنے رفیقوں کے ڈراوے دے رہا ہے تو تم ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو، اگر تم مومن ہو ۞ ۱۷۵

منظم کرنا شروع کیا اور مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دیا۔ حضورؐ کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے جاں نثار صحابہ کو ساتھ لیا۔ اور قریش کے تعاقب میں حمراء الاسد تک جا نکلے۔ یہ ان صحابہ کے عزم و ایمان کی تحسین کی ہے۔ اس مہم میں جنگ کی نوبت نہ آئی۔

۱۲۳ قاعدہ ہے کہ جن کنوؤں کے سوتے زوردار ہوں اس کے اندر سے جتنا ہی پانی نکالا جائے اتنا ہی اس کے سوتے اور زیادہ جوش کے ساتھ ابلتے ہیں۔ اسی طرح اصحابِ عزم و ایمان کو رکاوٹیں ضعیف کرنے کی بجائے اور زیادہ پرحوصلہ بنا دیتی ہیں۔ ہر آزمائش ان کی مخفی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان ان کے لیے فتح مندی کا ایک نیا میدان کھول دیتا ہے۔

تدبرِ قرآن

خالد مسعود

سورۂ آلِ عمران (۵)

اے ایمان والو! اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرمِ راز نہ بناؤ، یہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے، یہ تمہارے لیے زحمتوں کے خواہاں ہیں۔ ان کی عداوت ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی سخت تر ہے[۹۶]۔ ہم نے تمہارے لیے اپنی تنبیہات واضح کر دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو ۞ یہ تم ہی ہو کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو، وہ تو تم سے دوستی نہیں رکھتے حالانکہ تم ساری کتاب[۹۷] پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہہ دو تم اپنے غصہ میں مر جاؤ۔ اللہ سینوں کے بھید سے خوب واقف ہے ۞ اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جاتا ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ[۹۸] اختیار کرو گے تو ان کی چال تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے ۞ ۱۲۰

۹۶ یہ مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اب تم اہلِ کتاب سے تمام تعلقات دوستی و محبت ختم کر لو۔ اس لیے کہ اب تمہارے لیے ان کے دلوں میں دشمنی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور ان کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے۔

۹۷ پچھلے صحیفوں اور قرآن میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اہلِ کتاب کو کتابِ الٰہی کا صرف ایک حصہ دیا گیا تھا، پوری کتاب کا دیا جانا آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی پوری کتاب قرآن ہے اور ایک مسلمان خدا کی پوری کتاب پر ایمان لاتا ہے۔

۹۸ یہاں جس تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اس میں سب سے مقدم کفار کو اپنا محرمِ راز بنانے سے احتراز ہے۔

اور یاد کرو[۹۹] جب کہ تم اپنے گھر سے نکلے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے کے لیے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۝ ۱۲۱

جب کہ تم میں سے دو جماعتوں نے حوصلہ چھوڑ دینے کا ارادہ کیا حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا اور اللہ ہی پر چاہیے کہ اہل ایمان بھروسہ کریں ۝ اور اللہ نے تو تمہاری مدد بدر میں بھی کی تھی جب کہ تم نہایت کمزور تھے[۱۰۰]۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ اس کے شکرگزار رہ سکو ۝ ۱۲۳

یاد کرو کہ جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے ۝ ہاں اگر تم ثابت قدم رہوگے اور بچتے رہوگے اور وہ تمہارے اوپر بھی آدھمکے، تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا[۱۰۱]، جو اپنے خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے ۝ ۱۲۵

اور اللہ نے اس کو نہیں بنایا مگر تمہارے لیے بشارت اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہوجائیں

---

[۹۹] یہ غزوۂ احد کی طرف اشارہ ہے۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت کی بے تدبیری سے جو شکست پیش آئی اس نے اسلام اور کفر کی اس کشمکش سے تعلق رکھنے والے ہر گروہ پر کسی نہ کسی پہلو سے اثر ڈالا۔ کمزور مسلمان اس حادثہ سے بددل ہوئے، منافقین کو اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وسوسہ اندازی کا موقع ملا، یہود کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لیے شہ ملی اور قریش کو حوصلہ ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف مزید اقدام کریں۔ آگے کی آیات میں احد کے واقعات پر تبصرہ کرکے تمام غلط فہمیوں کو دور کیا گیا۔

[۱۰۰] یہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے جن کے اندر منافقین کی شرارت سے کچھ بزدلی پیدا ہوئی۔ منافقین جنگ کے لیے مدینہ سے باہر نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی اس خواہش کے علی الرغم جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر نکل کر لڑنے کا حکم دیا تو منافقین کا لیڈر عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ الگ ہوگیا۔ فرمایا کہ مسلمان جماعتوں کی تعداد پر نہیں بلکہ خدا کی مدد اور اس کی کارسازی پر بھروسہ رکھیں جس کا مشاہدہ وہ بدر کی جنگ میں کر چکے ہیں۔

[۱۰۱] تین سو منافقین کے الگ ہوجانے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے فرمایا کہ ان تین سو کے بدلے اللہ تعالیٰ تین ہزار تازہ دم فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تائید ہوئی کہ اگر مسلمان ثابت قدم رہے اور احکام کی نافرمانی سے بچتے رہے تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد کے لیے پانچ ہزار فرشتوں کو بھی نامزد کردے گا۔

اور مدد نہیں آتی مگر خدائے غالب وحکیم ہی کے پاس سے[۱۰۲] ۝ تاکہ اللہ کافروں کے ایک حصے کو کاٹ دے یا انہیں ذلیل کردے کہ وہ خوار ہوکر لوٹیں ۝ ۱۲۷

تمہیں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں[۱۰۳]، خدا ان کی توبہ قبول کرے یا انہیں عذاب دے۔ کیونکہ وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے ۝ ۱۲۹

اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا[۱۰۴]۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۝ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار ہے ۝ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۝ ۱۳۲

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے لیے مسابقت کرو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے[۱۰۵]، یہ پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے ۝ ان لوگوں کے لیے جو کشادگی اور تنگی ہر حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے[۱۰۶] ہیں اور خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے ۝ یہ لوگ جب کسی کھلی برائی کا ارتکاب یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرکے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں[۱۰۷] اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے؟ اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے ۝ یہ لوگ ہیں

---

[۱۰۲] یعنی یہ وعدۂ نصرت مسلمانوں کے لیے بشارت اور مخالفین ومنافقین کے رویے سے پیدا ہونے والی بددلی کو دور کرنے کے لیے تھا۔ یہ بشارت نہ بھی اترتی تو اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ فتح ونصرت ہمیشہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

[۱۰۳] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ ان منافقین کی روش اور کمزور مسلمانوں پر اس کے اثرات کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم غم نہ کرو، تم نے اپنا فرض کما حقہٗ انجام دے دیا تھا۔

[۱۰۴] آگے کی آیات میں جہاد کے تعلق سے انفاق پر ابھارا ہے اور انفاق کے حکم سے پہلے سود کی ممانعت کی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سچ بولنے کی ہدایت سے پہلے جھوٹ سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا کی قید محض صورت حال کی تصویر اور اس کے گھناؤنے پن کے اظہار کے لیے ہے ورنہ سود ہر نوعیت کا حرام ہے۔

[۱۰۵] جنت کی وسعت کی یہ ایک تمثیل ہے۔ اس کی اصل حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن اس وسعت کے باوجود انسان خدا کی راہ میں انفاق کرکے اس کو حاصل کرسکتا ہے۔

[۱۰۶] یہ انفاق کی وہ خصوصیات ہیں جن کے اہتمام کے بغیر نہ اس کا حق ادا ہوسکتا ہے اور نہ اس کو احسان کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے۔ (دیکھیے سورہ بقرہ، آیات ۲۶۲ تا ۲۶۵)

[۱۰۷] بدکاری اور عیاشی کی چاٹ کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کی راہ بند کردیتی ہے۔ سعادت کی راہ یہ ہے کہ آدمی

کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کے لیے ۝ تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے[107] ۝ یہ تنبیہ ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت و نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے ۝ ۱۳۸

اور پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو تمہی غالب[109] رہو گے ۝ اگر تمہیں کوئی چوٹ پہنچے تو اس سے پست ہمت نہ ہو، آخر دشمن کو بھی تو اسی طرح کی چوٹ پہنچی ہے[110]۔ یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے اندر الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ اللہ تمہارا امتحان کرے اور ممیز کر دے ایمان والوں کو اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا ۝ اور تاکہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کر دے اور کافروں کو مٹا دے[111] ۝ کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممیز نہیں کیا جنہوں نے جہاد کیا اور تاکہ ممیز کرے ثابت قدم رہنے والوں کو[112] ۝ اور تم موت کی تمنا کر رہے تھے اس سے ملنے سے پہلے سو اب تم نے اس کو دیکھ لیا، آنکھیں چار کر کے ۝ ۱۴۲

اس لت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔ اگر کبھی غلبہ جذبات سے کسی بڑے یا چھوٹے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو خدا کی یاد اس کو چوکنا کر دے اور وہ فوراً اس سے معافی مانگے۔

۱۰۸ اس تنبیہ و تہدید میں پیش نظر وہ لوگ ہیں جو یا تو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے یا صریح نفاق میں مبتلا تھے۔

۱۰۹ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو جو افتاد پیش آئی تھی یہ اس پر تنبیہ ہے کہ اس سے مرعوب اور خوف زدہ ہو کر ہمت نہ ہار بیٹھنا اور نہ اس نقصان کا جو تمہیں پہنچا غم کرنا۔ اسلام کے لیے فتح و غلبہ کی بشارتیں پوری ہو کر رہیں گی۔

۱۱۰ دشمن کو شکست کی چوٹ اسی جنگ احد میں اور اس سے پہلے جنگ بدر میں پہنچ چکی تھی۔

۱۱۱ یعنی فتح و شکست کے یہ رد و بدل جو ہوتے ہیں ان سے مقصود لوگوں کو جانچنا پرکھنا اور ان کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہوتا ہے۔ اسی سے سچے اور کچے، مخلص اور منافق میں امتیاز ہوتا ہے اور حق کے لیے جان کی بازی کھیلنے والوں کو شہادت کے منصب عالی قدر پر سرفراز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہ امتحان کھوٹ کو علیحدہ کر کے مسلمانوں کو زر خالص بنا دیں گے تو اس کے بعد اہل کفر کا مٹ جانا بھی قطعی ہو جائے گا۔

۱۱۲ یہ اشارہ ہے ان کمزور دل مسلمانوں کی طرف جو زبان سے شوق جہاد کا اظہار زیادہ کرتے تھے تاکہ ان کی کمزوری پر پردہ پڑا رہے۔ احد کی افتاد سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کی ایک کسوٹی سامنے آگئی۔

محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم الٹے پیچھے پھر جاؤ گے[113]؟ جو الٹے پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا ۝ ۱۴۴

اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔ جو دنیا کا صلہ چاہتے ہیں ہم انہیں دنیا میں سے دیتے ہیں اور جو اجر آخرت کے طالب ہیں ہم انہیں اس میں سے دیں گے[114] اور ہم شکر گزاروں کو بھرپور صلہ دیں گے ۝ ۱۴۵

اور کتنے انبیاء گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کے سبب سے جو انہیں خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو پست ہمت ہوئے نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے۔ اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۝ ان کی دعا تو ہمیشہ بس یہ رہی کہ اے رب! ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملے میں ہماری بے اعتدالیوں کو بخش دے[115]، ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں کے مقابل میں ہماری مدد فرما ۝ تو اللہ نے ان کو دنیا کا صلہ بھی عطا فرمایا اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے ۝ ۱۴۸

اے ایمان والو! اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو تمہیں الٹے پیچھے لوٹا کے رہیں گے[116] اور تم نامراد ہو کے رہ

---

۱۱۳ غزوہ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید ہو جانے کی خبر مشہور ہوگئی جس نے بہت سے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے۔ اس کمزوری سے منافقین و معاندین اسلام کی مخالفت میں بڑا فائدہ اٹھا سکتے تھے اس لیے واضح فرمایا کہ رسول اللہ کو نہیں بلکہ اللہ کے دین کو ہمیشہ باقی رہنا ہے۔ اس لیے دین کے ساتھ وابستگی اس مفروضہ پر مبنی نہیں ہونی چاہیے کہ آپ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے آئے ہیں۔

۱۱۴ یہ منافقین کی دو کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایک یہ کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں کہ جب تک نوشتہ الٰہی کی مدت پوری نہیں ہوگی اس وقت تک کسی کو موت نہیں آ سکتی، دوسرے یہ اپنے دنیوی مفادات کو تمام تر اپنی سعی و تدبیر ہی پر منحصر سمجھتے ہیں اور یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ اگر آخرت کے پیچھے زیادہ پڑے تو دنیا سے یک قلم محروم ہو جائیں گے۔

۱۱۵ یعنی احد کی ہزیمت پر آج لوگ پیغمبر کے خلاف طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن پچھلے انبیاء کے صحابہ کو جو افتاد پیش آئی وہ اس کو خدا اور رسول کی طرف منسوب کرنے کے بجائے خود اپنی کمزوری اور اپنی بے اعتدالی پر محمول کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتے۔

۱۱۶ کافروں کی بات سے مراد ان کا یہ پروپیگنڈا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں فتح یا شکست تدبیر اور وسائل کا کھیل ہے۔

جاؤ گے ۝ تمہارا مولیٰ تو اللہ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے ۝ ہم ان کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیں[١١٧] گے کیونکہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے ۝ ١٥١

اور اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا وہ سچ کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم خود ڈھیلے پڑ گئے اور حکم میں تم نے اختلاف[١١٨] کیا اور رسول کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کے تم تمنائی[١١٩] تھے۔ تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کے۔ پھر خدا نے تمہارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائش میں ڈالے اور اللہ مسلمانوں پر فضل فرمانے والا ہے ۝ یاد کرو جب کہ تم منہ اٹھائے بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور خدا کا رسول تم کو تمہارے پیچھے پکار رہا تھا تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا[١٢٠] تاکہ تم دل شکستہ نہ ہوا کرو، نہ کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ١٥٢

پھر خدا نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا یعنی نیند جو کہ تم میں سے ایک گروہ کو چھا لیتی ہے اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ یہ خدا کے بارے میں خلافِ حقیقت زمانۂ جاہلیت[١٢١] کے قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا ہے۔ یہ کہتے رہے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل؟ کہہ دو سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں

اس کو خدا اور اس کے فرشتوں سے وابستہ کر دینا اور اپنے آپ کو خدا کی مدد کا اجارہ دار سمجھ بیٹھنا محض خام خیالی ہے۔

١١٧ یعنی اس وقت کافروں کا حوصلہ بڑھ گیا ہے تو یہ محض ایک وقتی اور عارضی نشہ ہے۔ اس کی کوئی پائیدار بنیاد نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے حوصلے پست کر دے گا۔

١١٨ رسول اللہ نے درے کی حفاظت پر جن لوگوں کو اس قطعی ہدایت کے ساتھ مامور کیا تھا کہ وہ کسی حال میں بھی اس کو نہ چھوڑیں انھوں نے حکم کے منشا کے تعین میں اختلاف کیا اور ان کی اکثریت یہ سوچ کر کہ اب تو فتح سامنے ہے، رسول کے حکم کے خلاف مال غنیمت حاصل کرنے میں مصروف ہو گئی۔ یہ اس اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔

١١٩ مراد فتح کی تمنا ہے۔

١٢٠ یہ درے کی طرف سے کفار کے حملے کے بعد کی کیفیت کا بیان ہے۔ اس وقت ایک غم تو شکست کا تھا، دوسرا غم مسلمانوں کو اس افواہ سے لاحق ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیے گئے۔

١٢١ نیند دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی شہادت ہوتی ہے۔ جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اڑ جایا کرتی ہے۔ احد کی افتاد کے بعد کی شب میں مسلمانوں کی ایک جماعت بددل و ہراساں ہونے کے بجائے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے

وہ کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر اس امر میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کے رہتے[١٢٢]۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تم میں امتیاز کرے، جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کو پرکھے اور جو کچھ تمہارے دل میں ہے اس کو صاف کرے اور اللہ دلوں کے حالات سے خوب واقف ہے ۝ دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن جو لوگ تم میں سے پھر گئے ان کو شیطان نے ان کی بعض کرتوتوں کے سبب سے پھسلا دیا[١٢٣]۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۝ ١٥٥

اے ایمان والو! ان لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنھوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے بابت، جبکہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے، کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے۔ یہ خیال ان کے اندر اس لیے پیدا ہوا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں باعثِ حسرت بنا دے۔ اللہ ہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ خدا کی نگاہوں میں ہے ۝ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہوگے یا مرو گے تو وہ مغفرت اور رحمت جو تمہیں اللہ کی طرف سے حاصل ہوگی اس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں[١٢٤]۔ اور تم مرو یا قتل ہو، بہرحال اللہ ہی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے ۝ ١٥٨

یہ اللہ کا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خو ہو۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو تمہارے پاس سے

اطمینان کے ساتھ سوئی جو اس کی دل جمعی اور ایمانی مضبوطی کی شہادت تھی، دوسرا گروہ خدا سے بدگمانی میں مبتلا رہا اور اسے برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی۔

١٢٢ منافقین یہ پروپگنڈا کرتے کہ معاملات کے فیصلے کرنے میں اگر پیغمبر نے استبداد اور خود رائی سے کام نہ لیا ہوتا اور مدینہ کے اندر محصور ہو کر جنگ کرنے کی رائے مان لی ہوتی تو یہ افسوسناک صورت پیش نہ آتی۔ فرمایا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہ امور تمہاری تدبیر کے تابع نہیں بلکہ خدائی تقدیر کے تابع ہیں۔

١٢٣ گناہ سے گناہ جنم لیتا ہے۔ شیطان کے داؤں انھی لوگوں پر زیادہ آسانی سے کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر گناہ کی کوئی جڑ موجود ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی کسی گناہ کو دل میں جڑ نہ پکڑنے دے بلکہ استغفار اور توبہ کے ذریعے اس کا استیصال کرتا رہے۔

١٢٤ یہ آیت تہور کی دعوت نہیں دے رہی ہے بلکہ اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے موت کو ٹال سکتے ہیں وہ اس وہم سے ایک دائمی خلش غم اور بزدلی کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکتے۔ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی اور اس زندگی کے تمام لذتوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

یہ منتشر ہو جاتے[125]، سو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو، پس جب تم فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو[126]۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۝ اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں ہو سکتا اور اگر وہ چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی کے اوپر چاہیے کہ بھروسہ کریں اہل ایمان۝ ۱۶۰

اور ایک نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ بدخواہی کرے اور جو کوئی بدخواہی کرے گا تو قیامت کے دن وہ اپنی بدخواہی سمیت پیش ہوگا۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۝ کیا وہ جو خدا کی خوشنودی کا طالب ہو، اس کے مانند ہو جائے گا جو خدا کا غضب لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۝ خدا کے ہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں خدا اس کو دیکھ رہا ہے۝ ۱۶۳

یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے[128]۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی

---

[125] منافقین پر سخت الفاظ میں جو تنقید ہوئی اس کا اثر یہ پڑ سکتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ ان کے بارے میں سخت ہو جاتا۔ اس مرحلے میں یہ تبدیلی پسند نہیں فرمائی گئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کریمانہ طرز عمل کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و تصویب فرما دی گئی جو اب تک ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ سربراہ کی نرمی و چشم پوشی کی روش سے اجتماعی نظام میں وحدت، قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔

[126] نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیاسی و انتظامی معاملات میں صحابہؓ سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے۔ مشورہ کی یہ ہدایت صاحب امر کی تقویت اور اس کے اطمینان کے لیے ہوتی ہے۔ مشورے کے بعد جس بات پر اس کا دل ٹھک جائے اللہ کے بھروسے پر وہ کام اسے کر گزرنا چاہیے۔

[127] یہ منافقین کی کمزور روحوں کے دلوں میں اس وسوسہ اندازی کا جواب ہے کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے بہی خواہ اور وفادار نہیں ہیں، وہ ان کے اعتماد سے غلط فائدہ اٹھا کر ان کے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ نبی جو قدم بھی اٹھاتا ہے رضائے الٰہی کی طلب میں اور اس کے احکام کے تحت اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی امت کے ساتھ کبھی بے وفائی و بدعہدی نہیں کرتا۔

[128] اوپر کی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قوم کے ساتھ بدخواہی اور بے وفائی کے الزام سے بری قرار دیا گیا۔ اس آیت میں اس عظیم احسان کا اظہار کیا گیا جو آنحضرت کی بعثت کی شکل میں تمام دنیا پر اور خاص طور پر قوم عرب پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۝ ۱۶۴

اور کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی جس کی دونی مصیبت تم نے پہنچائی[129] تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آ گئی! کہہ دو یہ تمہارے اپنے ہی پاس سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۝ اور دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن تمہیں جو مصیبت پہنچی یہ اللہ کے حکم سے پہنچی اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کر دے۝ اور ان منافقین کو بھی ممیز کر دے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو دفع کرو۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اگر اندازہ ہوتا کہ جنگ ہونی ہے تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہوتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو یہ چھپاتے ہیں۝ یہ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں نہ قتل ہوتے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو خود اپنے آپ سے موت کو دفع کر لو۝ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ نہ خیال کرو[130]۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی مل رہی ہے۝ فرحاں و شاداں ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دے رکھا ہے اور ان لوگوں کے باب میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو ان کے اخلاف میں سے اب تک ان سے نہیں ملے ہیں کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے[131]۝ وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ اہل ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۝ ان اہل ایمان کے اجر کو جنہوں نے چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہی[132]۔ ان میں سے جنہوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیے اور جو تقویٰ کی راہ چلے ہیں

---

[129] مراد احد کی شکست کی مصیبت ہے جس سے دو چند مصیبت بدر میں قریش کو اٹھانی پڑی تھی۔ فرمایا کہ تم اس افتاد کو بدگمانی اور مایوسی کی دلیل نہ بناؤ۔

[130] یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھو۔ مردہ وہ نہیں ہیں بلکہ تم ہو جو اپنی جہالت اور بے بصیرتی سے ان پر ترس کھا رہے ہو کہ وہ مارے گئے۔

[131] یعنی شہداء کا عالم یہ ہے کہ دم بدم ان کو اپنے ان اخلاف سے متعلق جو ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ان سے ملنے کے آرزومند ہیں، یہ بشارت مل رہی ہے کہ وہ بھی عنقریب ان سے آ ملیں گے۔ یہاں شہداء پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوگا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کی باایمان ذریت کو ان کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا۔

[132] احد میں مسلمانوں کی شکست کے بعد قریش کی فوج واپس چلی گئی لیکن روحا کے مقام پر ابو سفیان نے اس کو دوبارہ

(بقیہ صہ ۳۰ پر)

امین احسن اصلاحی

آخرت اور جزا و سزا

فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں - ۱

آخرت اور جزا و سزا کے مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اہل فکر و فلسفہ نے خواہ وہ یونان کے ہوں یا مغرب سے تعلق رکھتے ہوں براہ راست اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔ انہوں نے جس سوال پر بحث کی ہے وہ یہ ہے کہ روح نامی کوئی چیز انسان کے اندر ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ مرنے کے بعد باقی رہتی ہے یا نہیں یہ سوال ایک غیر متعلق ہے جس کا آخرت کے مسئلہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور اگر ہے بھی تو محض ایک ضمنی تعلق ہے۔ اہل فلسفہ نے اس سوال پر صرف اس لیے غور کیا ہے کہ اگر جسم سے مختلف کوئی چیز روح نام کی موجود ہے اور وہ مرنے کے بعد باقی بھی رہتی ہے تب تو جزا و سزا، عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کا سوال پیدا ہوتا ہے لیکن اگر اس قسم کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا اگر موجود تو ہے لیکن مرنے کے بعد وہ بھی جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے تو آخرت کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ موخرالذکر صورت میں آخرت پر بحث لا حاصل ہو جاتی ہے۔

اہل فکر و فلسفہ نے روح اور اس کے عدم و بقا کے متعلق جن آراء کا اظہار کیا ہے ہم اختصار کے ساتھ ان کو بیان کریں گے۔ اس کے بعد اس پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد یہ بتائیں گے کہ قرآن مجید نے ہمیں کیا تعلیم دی ہے:

اہل فلسفہ کی آراء

یونان کے ابتدائی دور کے مفکرین نے اپنے نظریات کی بنیاد اپنے علاقوں کے مقبول عام تصورات پر رکھی۔ ان کے زمانہ میں یہ خیال عام تھا کہ انسان کے اندر ایک روح موجود ہے جو کسی لطیف چیز سے بنی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر انکسامینس (ANAXIMENES) نے کہا کہ یہ کائنات ہوا سے تشکیل پائی ہے اور روح لطیف ہوا سے بنی ہے۔ اسی روح کی بدولت انسان زندہ رہتا ہے۔ جب یہ جدا ہو جاتی ہے تو انسانی جسم فنا ہو جاتا ہے۔

فیثا غورث:

فیثا غورث (PYTHAGORAS) (۵۸۰ ق.م ——— ۵۰۰ ق.م) اور اس کے مکتب فکر کے دوسرے فلسفی اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد روح زندہ رہتی ہے۔ انسان کے اعمال کے مطابق روح کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر اعمال نیک ہوں تو روح ثواب کی مستحق ہوتی ہے اور اعمال برے ہوں تو روح کو عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ان فلسفیوں نے زندگی بسر کرنے کے لیے طویل اخلاقی ضوابط متعین کیے تاکہ مرنے کے بعد روح جزا کی مستحق ٹھہرے۔

ہیراقلیطس:

ہیراقلیطس (HERACLITUS) (۵۳۵ ق.م ——— ۴۷۵ ق.م) کا خیال ہے کہ کائنات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ یہ آگ ازل سے جل رہی ہے اور اس کو فنا نہیں۔ انسان کی تخلیق بھی اسی کے شعلہ سے ہوئی اور انسان کی روح آگ کے لطیف ترین اجزاء سے بنائی گئی۔ اس نے کہا کہ روح فنا نہیں ہوتی البتہ اپنی شکل تبدیل کرتی رہتی ہے۔ اس نے روحوں کی درجہ بندی بھی کی اور کہا کہ بعض روحیں خشک اور گرم ہوتی ہیں۔ یہ کائناتی روح سے زیادہ قریب تر ہوتی ہیں اس لیے یہ بہترین ارواح ہیں۔ دوسری ارواح خشک اور گرم نہیں ہوتیں اس لیے وہ کائناتی روح سے زیادہ قریب نہیں ہوتیں لہذا وہ اتنی اچھی بھی نہیں ہوتیں۔

امپیڈوکلیز:

(EMPEDOCLES) (۴۹۵ ق.م ——— ۴۳۵ ق.م) یہ فلاسفر تناسخ کے نظریہ کا بانی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ روح فنا نہیں ہوتی بلکہ انسان کے مرنے کے بعد یہ دوسرے انسان میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس بات کا قائل نہیں کہ ارواح کے لیے کوئی خاص مقام مقرر ہے جہاں وہ مرنے کے بعد جمع ہوتی رہتی ہیں بلکہ اس کا کہنا ہے کہ ایک جگہ جمع ہونے کے بعد وہ ایک جسم سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس فلسفی نے بعد کے مفکرین پر گہرا اثر ڈالا۔

لیوسپس اور دیموکریٹس:

لیوسپس (LEUCIPPUS) اور دیموکریٹس (DEMOCRITUS) (۴۶۰ ق.م ——— ۳۷۰ ق.م)

یہ دونوں فلسفی کائنات میں جوہریت (ATOMISM) کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا ننھے منے ذرات یا جوہروں (ATOMS) سے مل کر بنی ہے۔ روح آگ کے لطیف ترین اور گول ترین ذرات سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ ذرات انسان کے پورے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دو ایٹم کے درمیان ایک روحانی ایٹم ہوتا ہے۔ انسان جب سانس لیتا ہے تو روحانی ایٹموں کو باہر نکالتا اور اندر کھینچتا ہے۔ جب وہ مر جاتا ہے تو اس کے روحانی ایٹم پوری دنیا میں بکھر جاتے ہیں۔ اس کی مثال شیشے کے مرتبان کی ہے جس میں روحانی ذرات بھرے ہوئے ہوں۔ جب یہ مرتبان ٹوٹ جائے گا تو روحانی ایٹم بکھر جائیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ کائنات میں بکھر جانے کے بعد یہ روحانی ایٹم فنا نہیں ہوتے بلکہ دوسرے جسم میں داخل ہو کر از سر نو ترتیب پاتے ہیں جس سے نئی زندگی وجود میں آتی ہے۔ یہ ایٹم ازلی اور ابدی ہیں۔ البتہ یہ اپنی ترتیب بدلتے رہتے ہیں جن سے نئی زندگیاں وجود میں آتی ہیں۔ گویا ان فلسفیوں نے تناسخ کی ایک توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی روح کی فنا کے قائل نہیں۔

افلاطون :

افلاطون (PLATO) (۴۲۸ ق۔م ــــ ۳۴۸/۳۴۷ ق۔م) کے نزدیک روح کو فنا نہیں اور یہ ازلی اور ابدی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ روح دو اقسام کی ہوتی ہے۔ ایک جہانی اور دوسری انسانی روح۔ دنیا کے وجود میں آنے سے قبل تمام انسانوں کی ارواح جہانی روح کی صحبت میں رہیں جہاں انہوں نے تمام حقائق کا مشاہدہ کیا اور ان کو تمام باتیں سکھائی گئیں۔ لیکن یہ ارواح جب دنیا میں آئیں اور انسانی جسم میں داخل ہوئیں تو جسم ان کا قید خانہ ثابت ہوا جس کی وجہ سے ارواح وہ تمام باتیں بھول گئیں جن کا انہوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ لیکن ان ارواح کو تذکیر کے ذریعہ وہ تمام باتیں یاد دلائی جا سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے روح کے لیے علم کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ اس کا بھولا ہوا سبق ہے۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ ارواح کا اصل مقام جسم نہیں بلکہ وہی جگہ ہے جہاں سے یہ آئی ہیں، اس لیے وہ اس قید خانہ سے رہائی حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔ جو ارواح اس میں کامیاب ہو جاتی ہیں وہ ستاروں کی دنیا میں واپس چلی جاتی ہیں اور جہانی روح میں ضم ہو کر دائمی خوشی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ جو ارواح اس میں کامیاب نہیں ہوتیں وہ دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ پس افلاطون بھی تناسخ کا قائل ہے۔

ارسطو :

ارسطو (ARISTOTLE) (۳۸۴ ق۔م ــــ ۳۲۲ ق۔م) کے نزدیک زندگی جس

نسل میں بھی پائی جاتی ہے اس میں روح موجود ہوتی ہے یعنی انسانوں کے علاوہ حیوانوں اور درختوں میں بھی روح ہوتی ہے۔ انسانوں میں دو قسم کی روح ہوتی ہے۔ ایک وہ روح جو اس کی حیوانی ضروریات سے متعلق ہوتی ہے جس کو وہ ارضی روح کا نام دیتا ہے دوسرے وہ روح جو ارضی روح سے بلند تر ہے اور غور و فکر کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کو وہ آسمانی روح کا نام دیتا ہے وہ شعلۂ یزدانی ہے جو خدا نے انسانوں کے اندر رکھا ہے۔ انسان جب مر جاتا ہے تو ارضی روح فنا ہو جاتی ہے لیکن آسمانی روح شعلۂ یزدانی میں جا کر ضم ہو جاتی ہے۔

ابیقوری فلاسفہ :

ابیقوری (EPICUREANS) (۳۴۱ ق۔م ــــ ۲۷۰ ق۔م) فلسفیوں نے اپنے فکر و فلسفہ کی بنیاد جوہریت کے قائل (ATOMISTS) فلسفیوں کے خیال پر رکھی۔ لہٰذا ان کے نزدیک دنیا کی تمام چیزوں کی طرح روح بھی چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنی ہے البتہ یہ ذرات بہت لطیف ہیں اور مختلف اقسام کے ہیں۔ یہ ذرات پورے جسم میں بکھرے ہوتے ہیں اور جب انسان مر جاتا ہے تو وہ دنیا میں بکھر جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک جس طرح موت جسم کو فنا کر دیتی ہے اسی طرح روح کو بھی فنا کر دیتی ہے۔

رواقی فلاسفہ :

رواقی (STOICS) فلسفیوں کے نزدیک روح شعلۂ یزدانی کا ایک حصہ ہے۔ انسانی جسم میں اس کا مسکن دل ہے۔ روح سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس لیے یہی ہمارے علم کا سرچشمہ ہے۔ کیا مرنے کے بعد روح باقی رہتی ہے؟ اس سوال پر ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ صرف اچھی اور دانشمند ارواح باقی رہتی ہیں باقی سب جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہیں۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اچھی اور بری ارواح اس وقت تک باقی رہیں گی جب تک دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔

پلوٹینس :

پلوٹینس (PLOTINUS) (۲۰۴ء ــــ ۲۶۹ء) پلوٹینس افلاطون کا مقلد معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانی روح جہانی روح کا حصہ ہے۔ ابتدا میں انسانی روح جہانی روح کی صحبت میں رہی جہاں اس نے تمام نیکیاں سیکھیں۔ چونکہ روح میں مادہ کے لیے زبردست کشش تھی، اس لیے یہ اپنے مقام سے گر کر مادہ میں داخل ہو گئی۔ اب اس کی نجات کی یہی صورت ہے کہ وہ اس دلدل سے نکل کر دوبارہ جہانی روح

میں شامل ہو جائے۔ جو روح جسم کے قید خانہ سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو جاتی ہے وہ انسان کے مرنے کے بعد خدا کے پاس چلی جاتی ہے۔ ناکام رہنے والی روحیں کسی دوسرے انسان کے جسم، جانور یا پودے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے روح فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کا مسکن تبدیل ہو جاتا ہے۔

سینٹ آگسٹائن :

عیسائی متکلمین کا کہنا ہے کہ روح اور جسم دو متضاد چیزیں ہیں۔ روح انسانی جسم میں تمام اچھائیوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ موت جسم کو آلائشوں سے پاک کر دیتی ہے، جس کے بعد جسم روح کے رہنے کے لیے موزوں جگہ بن جاتا ہے۔ اس میں روح ابد تک رہتی ہے۔

اسی نقطہ نظر کو سینٹ آگسٹائن (SAINT AUGUSTINE) (۳۵۴ء ـــــ ۴۳۰ء) نے یوں بیان کیا کہ انسان کا جسم روح کا قید خانہ ہے۔ کیونکہ جسم تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ روح کو فنا نہیں لہٰذا انسان کے مرنے کے بعد بھی روح باقی رہتی ہے۔ اگر انسان نے دنیا میں زندگی خدا کی رضا کے مطابق گزاری ہو تو روح کو ثواب ملتا ہے۔ بصورت دیگر اس کو عذاب دیا جاتا ہے۔ انسان خدا کے فضل و کرم سے چھوٹتا ہے۔ خدا کا فضل ان لوگوں پر ہوتا ہے جو حضرت مسیح جن کو خدا نے نسل انسانی کے گناہوں کا کفارہ بنایا ہے، خدا کا بیٹا مان لیں۔

تھامس ایکوائناس :

ایکوائناس (THOMAS AQUINAS) (۱۲۲۵ء ـــــ ۱۲۷۴ء) کا کہنا ہے کہ روح کو خدا نے پیدا کیا۔ یہ انسانی جسم کا بنیادی حصہ ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اسی کے اندر ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو روح اس میں پھونک دی جاتی ہے اور جب انسان مر جاتا ہے تو روح فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک نئی ذی روح ہستی کو جنم دیتی ہے جس میں یہ ابد تک رہتی ہے۔

فرانسس بیکن :

کلیسا کے تاریک دور کے بعد جس میں عقل کے دیو کو زنجیروں میں جکڑ کر سلا دیا گیا تھا جب عقل کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی اور سائنس کی نئی نئی ایجادات سامنے آئیں تو فلسفیوں نے کلیسا کے تصورات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) (۱۵۶۱ء ـــــ ۱۶۲۶ء)

نے کی جس نے مصالحانہ روش اختیار کی۔ اس نے کہا کہ انسانی روح کے دو جزو ہیں ایک ملکوتی روح اور دوسری جسمانی روح۔ ملکوتی روح مذہب کے دائرہ میں آتی ہے۔ اس کی توجیہ کرنا مذہبی لوگوں کا کام ہے۔ البتہ جسمانی روح پر غور و فکر کیا جا سکتا ہے اور سائنس کے جدید طریقوں سے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ بیکن نے کہا کہ جسمانی روح کا مسکن دماغ ہے۔ جہاں سے اعصاب کے ذریعہ یہ پورے جسم میں جاری و ساری رہتی ہے۔ یہی روح عقل و دانش، تخیل، سوجھ بوجھ، یادداشت، جذبات اور خواہشات کی محور ہے۔ یہ روح اگرچہ مادی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ موت کے ذریعہ جسم کے ساتھ یہ بھی فنا ہو جاتی ہے۔

تھامس ہابس :

ہابس (THOMAS HOBBES) (۱۵۸۸ء ـــــ ۱۶۷۹ء) نے ماضی سے مکمل طور پر پیچھا چھڑا لیا اور روح کا انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ ساری کائنات مادی ہے اس لیے اس کے اندر روح نام کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ کے بعد اس سوال کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ انسان کے مادی جسم کے فنا ہو جانے کے بعد روح باقی رہتی ہے یا نہیں۔

ڈیکارٹ :

مشہور فلسفی ڈیکارٹ (DESCARTES) (۱۵۹۶ء ـــــ ۱۶۵۰ء) کے نزدیک روح خدا کا حصہ ہے۔ ادراک، تعقل و تفکر اور احساسات کا یہی سرچشمہ ہے۔ جب تک خدا باقی ہے روح بھی باقی رہے گی۔ جسم کی موت محض حالت کی تبدیلی ہے۔ روح جسم سے بالاتر چیز ہے اس لیے موت سے روح متاثر نہیں ہوتی۔

اسپینوزا :

اسپینوزا (SPINOZA) (۱۶۳۲ء ـــــ ۱۶۷۷ء) کا کہنا ہے کہ اصل حقیقت اور جوہر خدا ہے۔ روح خدا کی مختلف شانوں میں سے ایک شان ہے اس لیے روح سائنسی قوانین کے تابع نہیں بلکہ روحانی قوانین کے تابع ہے۔ خدا کی شان ہونے کی وجہ سے روح کو فنا نہیں کیونکہ خدا کو بھی فنا نہیں۔ یہ خدا کی مرضی ہے کہ وہ اپنی شان کو کس شکل میں اور کب تک نمایاں رکھے۔ انفرادی حیثیت میں خدا نے روح کو انسانی جسم کی شکل میں نمایاں کیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ موت کے بعد جو دراصل جسم میں تغیر کی شکل ہے روح باقی رہے۔

جان لاک :

جان لاک (JOHN LOCKE) (۱۶۳۲ء ــــ ۱۷۰۴ء) کا خیال ہے کہ دنیا دو چیزوں مادہ اور روح سے مل کر بنی ہے۔ انسان کے اندر سوچنے سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے کی جو صلاحیت موجود ہے اس کے ذریعہ وہ روح کا قائل ہوا ہے روح کے اندر غور و فکر، تعقل و تفکر، ادراک اور قوت عمل موجود ہے۔ لاک کے نزدیک روح کے دو پہلو ہیں، ایک فعال اور دوسرا منفعل۔ فعال روح دوسروں پر اثرانداز ہوتی ہے اور منفعل روح متاثر ہوتی ہے۔ جہاں تک روح کے فنا اور بقا کا سوال ہے، یہ مسئلہ سرحد ادراک سے پرے ہے لیکن اعتقاد کی بنیاد پر یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ روح کو فنا نہیں۔

جارج برکلے :

برکلے (GEORGE BERKLEY) (۱۶۸۵ء ــــ ۱۷۵۳ء) کے نزدیک دنیا میں دو ہی حقیقتیں ہیں، ایک روح اور دوسری ذہن۔ ہمارے تصورات ذہن کی پیداوار ہیں۔ ایسے تصورات بھی ہیں جو انسان کے ذہن میں نہیں آتے ان کو خدا تخلیق کرتا ہے کیونکہ خدا بھی ایک ذہن ہے۔ برکلے نے کہا کہ روح کا نہ تو کوئی ابتدا اور اس کی انتہا ہے اس لیے روح کو فنا نہیں۔

ڈیوڈ ہیوم :

ہیوم (DAVID HUME) (۱۷۱۱ء ــــ ۱۷۷۶ء) تشکیک کے فلسفہ کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جسمانی یا روحانی اشیاء کے متعلق ہم یقینی طور پر کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ ہم یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ کوئی خارجی دنیا اور روح موجود ہے۔ ہمیں صرف خیالات کا ایک تسلسل نظر آتا ہے جن کی بنیاد کو روح کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن اس کے متعلق ہم کچھ جان نہیں سکتے۔ اس لیے یہ کہنے کی کوئی بنیاد نہیں کہ روح کو فنا نہیں ہے۔

لائبنز :

لائبنز (LEIBNITZ) (۱۶۴۶ء ــــ ۱۷۱۶ء) لائبنز کی رائے میں دنیا چھوٹے چھوٹے ذرات یا اکائیوں سے مل کر بنی ہے۔ یہ ذرات اپنی جگہ مکمل اکائی ہیں۔ ان میں روح بھی شامل ہے جو روحانی قوت کی اکائی ہے۔ روح تمام علم و دانش کا منبع ہے۔ یہ علم اس کو نتائج سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ خزانہ اسی کے اندر مدفون ہے۔

انسان کے تجربات اور خارج کے واقعات اس مدفون خزانہ کو نکالنے کے لیے روح کے اندر تحریک پیدا کرتے ہیں۔ لائبنز کے نزدیک انسان کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ موت کے وقت ذرات الگ ہو جاتے ہیں لیکن فنا نہیں ہوتے اس لیے روح موت کے بعد فنا نہیں ہوتی بلکہ باقی رہتی ہے۔

عمانویل کانٹ :

عظیم فلسفی کانٹ (IMMANUEL KANT) (۱۷۲۴ء ــــ ۱۸۰۴ء) کا کہنا ہے کہ تمام نیکیوں اور اچھائیوں کا سرچشمہ روح ہے اور یہی اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے۔ چونکہ اس زندگی میں انسان کے لیے اخلاقی قوانین کی مکمل پاسداری ممکن نہیں ہوتی۔ اور وہ کسی نہ کسی مرحلہ میں بھٹک جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد روح باقی رہے تاکہ اس کی خامیاں دور ہو سکیں اور وہ تکمیل کے آخری مراحل طے کر کے اخلاقی قوانین کے مکمل طور پر تابع ہو جائے۔

جان فختے :

فختے (JOHANN FICHTE) (۱۷۲۶ء ــــ ۱۸۱۴ء) کے نزدیک روح اس امر ربی یا دانش کا حصہ ہے جس نے اس کائنات کو وجود بخشا۔ اس عقل کل نے انسان کے اندر روح پھونکی جس کے اندر تمام اچھائیوں اور برائیوں کا شعور رکھ دیا گیا ہے۔ انسانی روح کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر جو اخلاقی صفات مضمر ہیں ان کے حصول کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ اس مقصد کے لیے روح کا باقی رہنا ضروری ہے لہٰذا روح کو فنا نہیں۔

آرتھر شوپنہائر :

شوپنہائر (ARTHUR SCHOPENHAUER) (۱۷۸۸ ــــ ۱۸۶۰ء) کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا اور بنیادی داعیہ زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ یہ داعیہ کائناتی داعیہ کا جزو ہے اور موت کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ کائناتی داعیہ میں ضم ہو جاتا ہے۔ شوپنہائر نے اس داعیہ کا جو تصور پیش کیا ہے وہ کم و بیش وہی ہے جو دوسرے فلسفیوں نے روح کے متعلق پیش کیا ہے۔

ہرمن لوٹزے :

جرمن فلسفی لوٹزے (HERMAN LOTZE) (۱۸۱۷ء ــــ ۱۸۸۱ء) کے نزدیک روح انسان کے

تمام افعال و اعمال کو کنٹرول کرتی ہے اور اس کا مسکن دماغ ہے۔ ووزے نے اگرچہ اس سوال کا واضح جواب نہیں دیا کہ موت کے بعد روح کا کیا بنتا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ ایک ایسا وقت اور جگہ ہونی چاہیے جہاں انسان کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے۔ یعنی وہ قیامت اور روح کی بقا کا قائل ہے۔

آگسٹ کامٹ :

کامٹ (AUGUSTE COMTE) (۱۷۹۸ء ——— ۱۸۵۷ء) کا کہنا ہے کہ روح کی تلاش اور اس کے ہمیشہ باقی رہنے کا خیال بچگانہ خیال ہے۔ یہ اس وقت کا تصور ہے جب انسان نے ترقی نہیں کی تھی۔ ترقی کے ساتھ ساتھ انسان اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ان تصورات کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہ محض خام خیالی ہے۔ اس لیے اس کو ترک کر دینا چاہیے۔

ولیم جیمز :

ولیم جیمز (WILLIAM JAMES) (۱۸۴۲ء ——— ۱۹۱۰ء) کے نزدیک غیر فانی روح کے تصور میں انسان کی اخلاقی زندگی کے لیے افادیت موجود ہے۔ اس سے زیادہ جیمز نے روح کے مسئلہ پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ دورِ حاضر کے فلسفی جان ڈیوی (JOHN DEWEY) (۱۸۵۹ء ——— ۱۹۵۲ء) کے نزدیک روح کو ماننے کی کوئی بنیاد نہیں اور یہ نظریہ نقصان دہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ بہت سی روایات وابستہ ہیں جو سائنسی طریقہ پر غور و فکر کی راہ میں مانع ہیں۔

اہل فلسفہ کی آراء پر تنقید

روح کے متعلق مشہور فلسفیوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے یہ ان کا خلاصہ تھا۔ اب ہم تنقیدی نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ یہ خیالات اصل مسئلہ کو حل کرنے میں کیا مدد دے سکتے ہیں اور فلاسفہ نے ایک ضمنی سوال پر جو بحث کی ہے اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔

روح کے انکار کا فلسفہ :

سب سے پہلے ان فلسفیوں کو لیجیے جو روح کے سرے سے منکر ہیں۔ اس گروہ کا سب سے بڑا نمائندہ تھامس ہابس (HOBBES) ہے۔ ڈیوڈ ہیوم (HUME)، آگسٹ کامٹ (COMTE) اور ڈیوی (DEWEY)

اسی گروہ میں شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس چیز کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں، ہم اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، اس کو ماننے کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں۔ اس کو ماننا اور مانتے چلے جانا ایک بچگانہ بات ہے۔ سائنس کے غلبہ کے اس دور میں روح کا انکار ایک متفق علیہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اس دور کے فلسفیوں کا کہنا ہے کہ دنیا کی تمام نیرنگیاں، کارفرمائیاں، ایجادات و اختراعات، تہذیب و تمدن کے جلوے یہ سب انسان کی عقل کا کرشمہ ہیں۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل نے بہت تجربے کر لیے ہیں لیکن روح نام کی کوئی چیز ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آئی۔

سوال یہ ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ کا کیا مطلب ہے؟ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی لیبارٹری میں لے جا کر جسمی حالت میں روح کو نہیں دیکھا گیا اور یہ تحقیق نہیں ہو گی کہ روح کے کس حصہ کا کیا کام ہے، اس کا عمل کیا ہے اور یہ کن اجزاء سے مرکب ہے، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو جس عقل پر بڑا ناز ہے کیا اس کا لیبارٹری میں لے جا کر معائنہ کر لیا گیا ہے اور اس کی ماہیت اسی طرح معلوم کر لی گئی ہے جس طرح پھیپھڑے، دل اور جگر کی ماہیت معلوم ہو چکی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور عقل کا جسمی حالت میں مشاہدہ ممکن نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ روح کو تو نہیں مانتے اور عقل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں حالانکہ دونوں کی پوزیشن ایک ہی ہے اور ان دونوں کو تجربہ کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم کو عقل کا شعور ہوتا ہے اور یہ شعور اتنا قوی ہوتا ہے کہ ہم عقل کو ماننے پر مجبور ہیں، جب کہ روح کا شعور نہیں ہوتا۔ غور کیجیے تو یہ بات بالکل غیر فلسفیانہ ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ قوی شعور اپنی انا (EGO) کا ہے اور اس کے بعد سب سے زیادہ قوی اور مضبوط شعور اپنے ارادے (WILL) کا ہے۔ میں ہوں، میں سوچتا ہوں، میں ادراک کرتا ہوں، میں جانتا ہوں، میں عمل کرتا ہوں، یہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں میری ہیں اور میرے تصرف میں ہیں، میں جس خواہش کو چاہوں دبا دوں، جس خواہش کو چاہوں ابھار دوں، جس قوت کو چاہوں استعمال کروں اور جس قوت کو چاہوں استعمال نہ کروں، ان تمام چیزوں کا نہایت قوی شعور انسان کے اندر موجود ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمام چیزیں انسان کی روح ہی کے مظاہر ہیں۔ ان کا شعور روح کا شعور ہے۔

جس عقل پر آپ کو ناز ہے اس کے متعلق انا (EGO) کو یہ اعتقاد ہے کہ یہ میری لونڈی ہے، یہ میری مشیر ہے، پس اس سے جب چاہوں اور جو چاہوں کام لے سکتا ہوں اور اپنے حق میں اس سے دلائل حاصل کر سکتا ہوں۔ جس چیز کو رد کرنا چاہوں اپنی اس لونڈی کو کہہ سکتا ہوں کہ اس کے خلاف دلائل کے انبار لگا دے۔ یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس سے مشورہ لوں یا نہ لوں اور وہ جو مشورے دے ان کو قبول کروں یا نہ کروں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اندر جو شعور سب سے زیادہ قوی ہے اس کو تو آپ نہیں مانتے اور جو شعور زیادہ سے زیادہ ایک لونڈی یا ایک مشیر کی حیثیت رکھتا ہے اس کو آپ اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ ساری کرشمہ سازیاں

ایجادات اور اختراعات سب اسی کی وجہ سے ملتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ملکہ کو تو آپ تسلیم نہیں کرتے مگر ملکہ کی لونڈی کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

ہم جس چیز کو انا (EGO) کہتے ہیں اور جس کے پاس ارادہ (WILL) ہے، جس کو یہ شعور ہے کہ یہ تمام جسمانی نظام، تمام قوتیں اور صلاحیتیں میری ہیں، اسی کو ہم روح کہتے ہیں۔ یہ روح ذمہ دار اور مسئول ہے یہی آپ کی شخصیت ہے، اسی کی اصلاح سے آپ اللہ کے بندے بنتے ہیں اور اسی کے بگڑنے سے شیطان کے بندے بنتے ہیں۔ عقل تو اس میں ایک ضمنی چیز ہے اگرچہ ہے بڑی قیمتی چیز۔ اس لئے جو لوگ روح کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ روح عقل کی نسبت اہم اور ملنے کی چیز ہے۔

اب رہ گیا روح کی فنا اور بقا کا سوال تو اگر آخرت کی ضرورت دوسری بنیادوں پر ثابت ہے تو اللہ تعالےٰ پر واجب ہے کہ وہ آخرت کو لائے اور اس کے لیے اس تمام نظام کو روح کو اور جسم کو بھی زندہ کرے۔

افلاطون کے فلسفہ کی غلطی

فلسفیوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو روح کو کسی نہ کسی شکل میں مانتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر فلسفی افلاطون ہے کیونکہ اس کے اثرات بہت دور تک ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام ارواح ستاروں کے جہان میں روح کائنات کے پاس موجود تھیں۔ یہ حسن و صداقت کا عالم تھا۔ اس میں وہ مسرور و شاداں تھیں۔ ان کو حقائق کا علم تھا لیکن وہ اس صحبت کو چھوڑ کر مادے اور جسم کی تلاش میں اس دنیا میں آئیں اور جسم اور مادہ کی دلدل میں پھنس گئیں۔ اب وہ اس سے نکلنے کی جدوجہد کر رہی ہیں تاکہ اس عذاب سے نکل کر واپس اسی عالم تک پہنچ جائیں اور وہی پہلے کی مسرت، سرور اور خوشی دوبارہ حاصل کریں۔ جو روحیں اس جدوجہد میں کامیاب ہو جاتی ہیں وہ روح کائنات کے پاس جمع ہو جاتی ہیں اور باقی روحیں ایک جون سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں عذاب سہتے پھر کاٹتی رہتی ہیں۔ افلاطون کی اس تقریر سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ارواح کو ایک عالم میں سرور اور شادمانی حاصل تھی اور ان کو عزت و شرف بھی حاصل تھا تو بیہودہ کیا وجہ تھی کہ انہوں نے اس دنیا میں آکر خود کو گرفتار کرایا۔ افلاطون اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتا۔

اس کے فلسفہ کی دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ اس دنیا کو شر کی دنیا کہتا ہے۔ اس کو مایا کا جال اور شیطان کا فتنہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک نجات کی واحد شکل یہ ہے کہ ارواح دنیا کے چکر سے چھوٹیں اور اسی عالم میں واپس جائیں جہاں سے وہ آئی تھیں۔ وہیں ان کا تزکیہ ہو سکتا ہے۔

افلاطون کے فلسفہ کا تیسرا کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ تناسخ کی ایک شکل کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے

اجسام روح کے قید خانے ہیں اور یہ روح کسی پہلے جون سے نکل کر ان میں داخل ہوگئی ہے۔

قرآن کا علم الانسان:

قرآن مجید نے جو علم الانسان دیا ہے وہ یہ ہے کہ جب آدمؑ کی تخلیق کا مرحلہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور جنات کو یہ حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ ابلیس کو یہ حکم ناگوار ہوا اور اس نے اس کی تعمیل نہ کی جس پر وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرا۔ وہ راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا۔ اس پر اس کو آدم کے ساتھ کد ہوگئی اور وہ اسے نیچا دکھانے کی فکر میں رہا۔ آدم کو بہشت میں مقام عطا کیا گیا۔ وہاں آدمؑ اور حواؑ دونوں بہت خوش اور مگن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو آگاہ کر دیا تھا کہ یہاں روٹی اور کپڑے کی تمہیں کوئی فکر نہیں ہوگی۔ تم آرام سے رہو گے اور عیش کرو گے۔ صرف ایک پابندی گوارا کرنی ہوگی کہ فلاں درخت کا پھل نہ کھانا۔ شیطان نے یہیں سے راستہ پالیا۔ اس نے آدم کو ورغلایا کہ آپ یہاں بڑے عیش و آرام سے تو ہیں لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہاں ہمیشہ رہیں گے۔ جس درخت کا پھل کھانے سے آپ کو روک دیا گیا ہے وہ ابدیت کا درخت ہے۔ اگر آپ نے اس درخت کا پھل نہ کھایا تو آج یہاں ہو کل نکالے جاؤ گے۔ جنت اور ابدیت چیزیں ہی ایسی ہیں کہ ان کے نام پر شیطان نے دھوکا دیا تو حضرت آدم دھوکا کھا گئے اور انہوں نے اس درخت کا پھل چکھ لیا۔ چونکہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی تھی اس لیے علم جنت ان سے چھن گیا۔ جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے فوراً توبہ واستغفار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ تو قبول کر لی لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ آدم، حوا، ان کی ذریت اور شیطان سب دنیا میں آئیں۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے شریعت نازل کرے گا اور شیطان انہیں ورغلانے کی کوشش کرے گا۔ ورغلانے سے زیادہ شیطان کو کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ جو لوگ شیطان کے ورغلانے کے باوجود خدا کی ہدایت پر قائم رہیں گے وہ تو جنت کے وارث ہوں گے اور جو شیطان سے مار کھا جائیں گے وہ اس کے ساتھ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

اس علم الانسان پر غور کرنے سے ان تمام باتوں کی ٹھیک ٹھیک توجیہ ہو جاتی ہے جو افلاطون کے بیان سے کھٹک پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً دنیا میں انسان کے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حضرت آدمؑ کو اپنے پاؤں میں مادے اور جسم کی بیڑیاں پہننے کا شوق تھا۔ وہ اس دنیا میں راضی خوشی نہیں آئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے انہیں بھیجا تاکہ وہ اور ان کی ذریت شیطان کے حملوں کا مقابلہ کر کے جنت کے لیے اپنی اہلیت ثابت کرے تاکہ اب جو ان کو جنت ملے تو استحقاق کی بنا پر ملے۔ یہ مفت کی جنت نہ ہو۔

اس علم الانسان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا نہ مایہ کا جال ہے اور نہ کوئی دارالعذاب۔ انسان اس

دنیا میں کسی مصیبت اور عذاب میں مبتلا نہیں بلکہ دارالامتحان میں ہے۔ یہ آخرت کی کھیتی اور ابدی مسرت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا میدان ہے۔ اس میں ہم خدا کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرکے ابدی زندگی حاصل کرسکتے ہیں اور خدا کی نافرمانیاں کرکے اپنے لیے ابدی لعنت بھی جمع کرسکتے ہیں۔ اس سے رہبانیت اور ترک دنیا کا بھی ابطال ہوجاتا ہے کیونکہ ترک دنیا کرنے والے وہ لوگ ہیں جو کمرۂ امتحان میں داخل ہونے کے لیے تیار نہیں اور اس سے باہر فاقہ اور ریاض کررہے ہیں۔ گویا یہ دریا میں اتر کر تیز و تند موجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تو تیار نہیں لیکن کنارے پر کھڑے ہوکر ہوا میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی اس جدوجہد کی کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی، وہ جو چاہیں دعوے کریں جب تک وہ کمرۂ امتحان میں نہ بیٹھیں اس وقت تک ان کے دعووں کی حقیقت واضح نہیں ہوسکتی۔

اس علم الانسان سے تناسخ کی بھی کامل نفی ہوجاتی ہے۔ اگر گناہوں کی پاداش میں ہماری روح جون بدلتی رہتی ہے تو ہمارے اندر یہ احساس ہونا ضروری تھا کہ ہم نے پچھلے عالم میں وہ کون سے گناہ کیے جن کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کا کوئی احساس ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ سب لوگ اپنے حال میں مگن اور اپنی سابقہ تاریخ سے ناواقف ہیں۔ سزا دینے کا صحیح طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے جرائم متعین کیے جاتے ہیں۔ اس کو بتا دیا جاتا ہے کہ تمہارے یہ جرائم ہیں جن کے باعث تمہیں فلاں سزا دی جارہی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جزا دینے کے لیے واضح طور پر بتایا جاتا ہے کہ تمہاری یہ نیکیاں ہیں جن کا صلہ تمہیں اس شکل میں دیا جانے والا ہے۔ لہٰذا ہماری روح اگر سزا پا رہی ہے تو یہ کیسی سزا ہے جس کا کوئی احساس و شعور ہمیں نہیں ہے۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ ایک امیر کی روح کسی غریب کے جسم میں ڈال دی گئی یا ایک غریب کی روح خنزیر کے جسم میں ڈال دی گئی یا خنزیر کی روح کتے کے جسم میں ڈال دی گئی تو یہ عقل میں آنے والی بات نہیں۔ کتوں اور بلیوں کا حال تو ہمیں نہیں معلوم، لیکن ہمارے اندر بہرحال اس قسم کا کوئی احساس موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اپنی روح ہے، ہم اس کے تزکیہ اور تطہیر کے ذمہ دار ہیں جس کے لیے ہم جدوجہد بھی کررہے ہیں، ہم کسی قید میں نہیں۔ ہمیں پوری آزادی ہے کہ ہم چاہے جنت کے لیے کوشش کریں، چاہے شیطان کی راہ پر چل نکلیں۔ آپ تسلیم کریں گے کہ قرآن مجید کا علم الانسان بالکل فطری، عقلی اور سائنٹیفک ہے۔

ارسطو کے فلسفہ کی خامی:

ارسطو نے روح کے متعلق جو خیالات بیان کیے ہیں ان کے اثرات بھی بہت گہرے ہیں۔ ارسطو روح کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک ارضی روح (PASSIVE SOUL) اور دوسری آسمانی روح (DIVINE SOUL)۔ وہ کہتا ہے کہ ارضی روح تو جسم کے ساتھ فنا ہوجاتی ہے اور آسمانی روح خدا کے پاس چلی جاتی ہے۔ ہمارے فلسفی یا فلسفیانہ ذہن رکھنے والے لوگ اس فلسفہ سے بہت متاثر ہیں۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ ایک چیز نسمہ یعنی جان ہے اور دوسری چیز روح ہے۔ روح ملکوتی نسمہ کو اپنی سواری بناتی ہے۔ مرنے کے بعد جب جسم فنا ہوجاتا ہے تو راکب واپس چلا جاتا ہے۔

دو روحوں کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ دونوں کی انا (EGO) اور ارادہ (WILL) بھی الگ ماننا پڑے گا اور دونوں کا سارا نظام بھی الگ ماننا پڑے گا۔ اگر ایک روح انا اور ارادہ سے خالی ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں، وہ درحقیقت روح کی نفی ہے۔ اگر دونوں الگ نظام رکھتی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ دو روحوں کی کشمکش میں مبتلا اور دو ارادوں اور دو اناؤں کی چپقلش میں گرفتار ہیں۔ اس طرح ایک تصادم اور کشمکش کی حالت پیدا ہونا ناگزیر ہوگا۔ لہٰذا تضاد کا شکار ہونا انسان کی فطرت کا تقاضا ہوگا۔ ایسی صورت میں انسان اگر شرک اور توحید ایک ساتھ اختیار کرے تو وہ قابل ملامت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک روح اس کو شرک کی طرف بلاتی ہو اور دوسری توحید کی طرف رہنمائی کرتی ہو۔ یہ بات عقل اور حقیقت کے خلاف ہے کہ انسان کے اندر دو متضاد ارادے ہوں۔ پس اگر کوئی روح انا اور ارادہ سے خالی ہے تو وہ روح کس طرح ہوئی، اس کو زیادہ سے زیادہ خون کی حرارت یا جان کہہ لیجیے، وہ روح بالکل نہیں۔ روح تو وہ ہوگی جس کا اپنا مستقل EGO، اپنا مستقل WILL ہو، جس کے اندر یہ شعور ہو کہ یہ سب قوتیں اور صلاحیتیں جو میرے اندر ہیں سب میرے اختیار میں ہیں۔ پس روح میں ثنویت کا ہونا بے دلیل بات ہے اور ارسطو کی تقسیم غلط ہے۔ عقل و فطرت اور فلسفہ کی رو سے روح کا ایک اکائی اور ایک وحدت ہونا لازمی ہے۔ اسی صورت میں اگر انسان تضاد فکر میں مبتلا ہوگا تو وہ مجرم ہوگا کیونکہ خدا نے تو تضاد کے اسباب نہیں رکھے۔ اگر انسان نے تضاد پیدا کیا ہے تو اپنی کج بحثیوں اور نافرمانیوں سے پیدا کیا ہے۔

ارسطو کے فلسفہ سے جزا اور سزا کی مکمل نفی لازم آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ارضی روح جسم کے ساتھ فنا ہوجاتی ہے اور آسمانی روح خدا کے پاس چلی جاتی ہے تو مسئول کون رہا؟ ارضی روح فنا ہوگئی اس لیے وہ مسئول نہیں۔ آسمانی روح خدا میں جاکر ضم ہوگئی تو خدا سے کون پوچھ سکتا ہے۔ روح اپنے نزدیک تو مجرم نہیں بنے گی۔ اسی طرح وحدت الوجود کے فلسفہ میں بھی آخرت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس میں اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ آپ کسی کو مسئول قرار دے سکیں۔ اسپینوزا چونکہ وحدت الوجودی ہے، وہ روح کو خدا کی شانوں میں سے ایک شان مانتا ہے۔ روح اگر خدا کی شان ہے تو انسان کے اچھے یا برے اعمال کے نتائج کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ وحدت الوجود ہمارے صوفیوں کا محبوب فلسفہ ہے لیکن یہ عقل اور قرآن کے خلاف ہے۔

فیثاغورث (PYTHAGORAS) کہتا ہے کہ روح کے مستقبل کا انحصار آدمی کے اعمال پر ہے۔ نیک اعمال ہوں گے تو اس کو جزا ملے گی، یہ اس کی بڑی خوش بختی کی زندگی ہوگی۔ برے اعمال ہوں گے تو اس کے لیے ابدی سزا کی زندگی ہوگی۔ فیثاغورث کی یہ رائے قرآن کے بالکل مطابق ہے۔

مذہب کی ترجمانی:

یہود کے ہاں روح کا سوال ضمنی طور پر آتا ہے۔ وہ جزا و سزا کو اسی معنی میں مانتے ہیں جس معنی میں قرآن میں ہے لیکن ان کے یہاں خرابی یہ ہے کہ وہ اپنے لیے صرف ثواب کو مانتے ہیں، عذاب کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں اس لیے ہمارے لیے سزا نہیں ہے۔ اگر یہ بالفرض ہوئی تو بالکل سرسری ہوگی۔

نصاریٰ کا کہنا ہے کہ آدم کے گناہ نے ہم سب کو جکڑ رکھا ہے۔ تمام نسل آدم باپ کے گناہ میں ازلی ابدی گنا ہگار ہوگئی ہے۔ اس گناہ سے چھوٹنے کے لیے انہوں نے اپنے جسم کو اذیت دینا ضروری قرار دیا۔ اس کے لیے انہوں نے رہبانیت اور ریاضت کا نظام ایجاد کیا لیکن سینٹ پال نے مسئلہ کو آسان بنا دیا۔ اس نے کہا کہ انسان صرف خدا کے فضل سے چھوٹتا ہے۔ بس جس پر خدا کا فضل ہوگا وہ اس جال سے نکلے گا۔ خدا کا یہ فضل ان لوگوں پر ہوگا جو حضرت مسیح کو اس کا بیٹا مان لیں جن کو اس نے نسل انسانی کے گناہوں کا کفارہ بنایا۔ اس طرح مذہب کی ترجمانی غلط ہوگئی اور فلسفہ کے سامنے صحیح طریقہ سے نہیں آئی۔

(جاری ہے)

(ترتیب : محبوب سبحانی)

تزکیۂ نفس
امین احسن اصلاحی

آدمی کا تعلق غرباء، ویتامیٰ اور پڑوسیوں سے

مومن ایمان سے فیض یاب ہو کر جس جگہ بھی بیٹھتا ہے اس کا بیٹھنا اس شجرۂ طیبہ کے مانند ہوتا ہے جس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں، اس کے خنک سایہ میں خلق پناہ لیتی اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے لوگ بہرہ یاب اور شاد کام ہوتے ہیں۔ قرآن میں اس کی تعریف "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ" (ابراهیم - ۱۴ : ۲۴) (جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں) کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ وہ ٹھونٹھ درخت کے مانند نہیں ہوتا، جس میں نہ سایہ ہو نہ پھل، صرف بار زمین بن کے رہ گیا ہو اور نہ اس درخت کے مانند جو اپنے اردگرد زمین کی ساری صلاحیتیں ہضم کر کے موٹا تو ہو جائے، لیکن نہ اس کا سایہ خوشگوار ہو نہ اس کے پھل۔

ایک مومن کا فیض جس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے ماحول میں بڑھتا اور پھیلتا ہے اس پر سورۂ نساء کی اس آیت سے نہایت عمدہ طریقہ پر روشنی پڑتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا	اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی	شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، قرابت مند، یتیم،
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ	مسکین، قرابت دار پڑوسی، بے گانہ پڑوسی، ہم نشین
الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ	مسافر اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔
وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ	اللہ اترانے اور بڑائی مارنے والوں کو پسند
مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا	نہیں کرتا۔

(النساء - ۴ : ۳۶)

اس آیت پر تدبر کیجیے تو اس سے بہت سی حقیقتیں سامنے آئیں گی جن سے واضح ہوگا کہ ایک مومن

کی زندگی پر اس کا ایمان کس نوعیت سے اثر انداز ہوتا ہے، اور درجہ بدرجہ کس طرح اس کو اردگرد کے لوگوں کے ساتھ حقوق اور فرائض کی لڑیوں میں پروتا چلا جاتا ہے۔

پہلی بات تو اس سے یہ سامنے آتی ہے کہ مومن پر سب سے بڑا حق اس کے رب کا ہے جو اس کا خالق اور تمام مادی و روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ حق بندگی، عبادت اور اطاعت کا ہے اور اس کی لازمی شرط یہ بتائی گئی ہے کہ یہ کامل اخلاص کے ساتھ ہو، اس میں کسی دوسری ذات یا کسی دوسری شے کو شریک نہ کیا جائے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے پر سب سے بڑا حق اس کے والدین کا ہے ظاہر ہے کہ اس کی پیدائش و پرورش میں جس نوعیت کا دخل ان کو ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے، لیکن یہ حق صرف احسان، فرماں برداری اور خدمت تک محدود ہے، خدا کے حقِ عبادت میں وہ بھی شریک نہیں کیے جاسکتے۔ بلکہ ان کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ اولاد کو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل سے روک سکیں۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ والدین کے بعد قرابت داروں کا حق ہے خواہ وہ پدری رشتہ سے قرابت دار ہوں یا مادی رشتہ سے۔ یہ بھی حسنِ سلوک، محبت اور صلۂ رحم کے حق دار ہیں۔

چوتھی ایک نہایت دقیق حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ قرابت داروں کے بعد اس احسان میں یتامیٰ اور مساکین بھی شامل ہیں، ان کا ذکر اس طرح آیت میں آیا ہے گویا یہ بھی قرابت داروں ہی کے زمرہ میں شامل ہیں جس کے معنی یہ ہوتے کہ اسلامی معاشرہ میں یتامیٰ اور مساکین کو ہر آدمی اس نگاہ سے دیکھے گویا وہ اس کے عزیز و رشتہ دار ہیں اور اسی جذبہ سے ان کی خدمت اور سرپرستی کرے، خاص طور پر یتامیٰ سے متعلق تو یہ تصریح بھی قرآن میں آئی ہے کہ ان کے ساتھ صرف احسان کا نہیں، بلکہ اکرام کا سلوک کیا جائے؛ یعنی وہ کس مپرسی کی زندگی کے بجائے اسلامی معاشرہ میں سب کی آنکھوں کے تارے بن کر زندگی گزاریں اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے سب بیدار اور چوکنے رہیں۔

آیت کے آخر میں پڑوسی کا ذکر آیا ہے اور یہ ذکر اس طرح آیا ہے کہ آدمی سب سے پہلے قرآن کی اس آیت ہی سے یہ جانتا ہے کہ پڑوسی کا مفہوم کتنا وسیع ہے۔ جن لوگوں نے مذاہب اور معاشرتی اخلاقیات کا مطالعہ کیا ہے وہ کوشش کے بعد بھی یہ سراغ نہیں دے سکتے کہ قرآن سے پہلے کسی مذہب نے بھی پڑوسی کا یہ تصور دیا ہو۔ چونکہ یہ مسئلہ معاشرتی پہلو سے غایت درجہ اہمیت رکھنے والا ہے، لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارا یہی معاشرہ، جس کے ہر گوشہ میں جنگل کا قانون کارفرما ہے، جنت کے معاشرے کی مثال بن گیا ہے۔ اس وجہ سے ہم اس پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔

پڑوسی کی تین قسمیں:

عام طور پر لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ جس کا مکان ان کے مکان سے متصل اور جس کا دروازہ ان کے دروازے کے سامنے ہو وہ ان کا پڑوسی ہے، حالانکہ یہ صرف پڑوسی کی ایک قسم ہے۔ قرآن مجید نے تین قسم کے لوگوں کو آپ کے پڑوسی کا درجہ دیا ہے۔

پہلی قسم کا پڑوسی:

ایک پڑوسی وہ ہے جو آپ کا پڑوسی بھی ہے اور قرابت مند بھی ہے۔ قرآن نے اس کو 'جار ذی القربیٰ' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کی ہمدردی اور مدد کا دوسرے پڑوسیوں سے زیادہ حق دار ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ تصریح بھی ہے کہ اگر اس کے خلاف دل میں کسی سبب سے کچھ کدورت بھی ہو جب بھی اس کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح کے قرابت دار کے لیے جو انفاق کیا جائے گا اس کا اجر زیادہ ملے گا۔

یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ حقوق جو بیان فرمائے ہیں ان میں ترتیب 'الاقدم فالاقدم' کی ہے اور اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو ملحوظ نہ رکھے بلکہ اپنی خواہشات کی پاسداری میں اس کو الٹ پلٹ دے تو اندیشہ ہے کہ وہ اپنے انفاق سے کچھ اجر کمانے کے بجائے اس کو بالکل ضائع کر بیٹھے فرض کیجیے، ایک شخص کو اپنے والدین کے حقوق کا کچھ تو خیال نہیں ہے، لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کی لڑکیوں کے جہیز تیار کرانے میں بڑا فیاض ہے یا اپنے قرابت دار پڑوسی سے تو بے پرواہ ہے، لیکن دوسروں کی حمایت و ہمدردی میں بڑا سرگرم ہے تو گو اس کے یہ کام نیکی اور بھلائی کے ہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی ترتیب کو بدل دینے کے سبب سے اپنا اجر کھو بیٹھے گا۔

دوسری قسم کا پڑوسی:

دوسرا پڑوسی وہ ہے جو اگرچہ آپ کا قرابت دار تو نہیں ہے، لیکن پڑوسی ہے۔ قرآن نے اس کو 'الجار الجنب' (اجنبی پڑوسی) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اجنبیت رشتہ اور قرابت نہ ہونے کے سبب سے بھی ہو سکتی ہے اور دینی اشتراک نہ ہونے کے باعث بھی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے، وہ کوئی ہندو، عیسائی یا پارسی ہے اور آپ مسلمان ہیں۔ اس اجنبیت کے باوجود وہ آپ کا پڑوسی قرار پائے گا اور از روئے قرآن یہ آپ کا فرض ہوگا کہ آپ اس

سے حقوق جار کا احترام ملحوظ رکھیں۔ بعض صورتوں میں دین اور قرابت کی بنیاد پر کسی کو ترجیح و تقدیم تو حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ایک فطری اور عقلی چیز ہے لیکن یہ ترجیح و تقدیم دوسرے کے واجبی حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ہوگی، ان کو نظر انداز کرکے نہیں ہوگی۔

تیسری قسم کا پڑوسی :

تیسری قسم کا پڑوسی وہ ہے جو عام مفہوم میں تو پڑوسی نہیں ہے، لیکن ریل میں، بس میں، ہوائی جہاز میں، ہوسٹل میں، ہوٹل میں، مجلس میں، مسجد میں، مدرسہ میں عارضی اور وقتی طور پر آپ کا ہم نشین یا ساتھی بن گیا ہے۔ قرآن نے اس کو 'الصاحب بالجنب' (ہم نشین) سے تعبیر کیا ہے اور اس کے لیے بھی اسی طرح احسان اور حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے جس طرح مذکورہ بالا قسم کے پڑوسیوں کے لیے فرمائی ہے۔ حالات اور مواقع کے لحاظ سے حسن سلوک اور ہمدردی کی صورتیں مختلف ہو جائیں گی۔ لیکن یہ بہرحال آپ پر واجب ہوگا کہ آپ ہر جگہ اس کے لیے ایک شریف، کریم النفس اور قابل اعتماد ساتھی ثابت ہوں اور یہ چیز صرف ایک اخلاقی فضیلت کی حیثیت سے مطلوب نہیں ہے بلکہ آگے آپ دیکھیں گے کہ یہ ایمان کا بدیہی تقاضا ہے۔

پڑوسی کے حقوق کی اہمیت :

اب آیئے دیکھیے کہ پڑوسی کے حقوق کی اہمیت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضورؐ کا یہ ارشاد سامنے رکھیے جس کی روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمائی ہے:

عن عائشۃ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: مازال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ[1]	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے باب میں نصیحت کرنی شروع کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب وہ اس کو (پڑوسی کو) وراثت میں حصہ دار بنا دیں گے۔

پڑوسی کے حقوق کی عظمت و اہمیت کی اس سے زیادہ دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ

[1] جامع الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ۲۸

ہر چند وہ رحمی اور صلبی قرابت داروں کی طرح وراثت میں تو حصہ دار نہیں بنایا گیا ہے، لیکن اس کے حقوق کی اہمیت کے اعتبار سے اس کو بھی اسی جملہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ احسان و اکرام کا جو حکم دیا گیا ہے اس کو محض ایک فضیلت اور نیکی نہیں خیال کرنا چاہیے، بلکہ ایک حق واجب کی طرح ادا کرنا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی سے متعلق حقوق و فرائض کی وضاحت مثبت اور منفی، دونوں ہی پہلوؤں سے فرمائی ہے۔ یعنی یہ بھی بتایا ہے کہ اپنے آپ کو ایک اچھا پڑوسی ثابت کرنے کے لیے ایک مومن کو اپنے پڑوسی کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح کی باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ ان سب باتوں کی تفصیل میں طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم تفصیل میں جانے کے بجائے دو اصولی باتیں عرض کرتے ہیں۔ امید ہے ان کی روشنی میں ہر طالب خیر خود تفصیل کو سمجھ لے گا۔

مثبت پہلو سے اصولی ہدایت :

مثبت پہلو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت دی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین پڑوسی وہ ہے جس کا معاملہ اپنے پڑوسی کے ساتھ بہترین ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: خیر الاصحاب عند اللّٰہ خیرھم لصاحبہ وخیر الجیران عند اللّٰہ خیرھم لجارہ[1]	انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہترین رہا ہے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہترین ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے بہترین ساتھی یا بہترین پڑوسی ہونے کا فیصلہ اس کے تعلقات اور روابط سے الگ کرکے نہیں ہو سکتا، بلکہ لازم ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زندگی کے مختلف مراحل میں وہ جن کا ساتھی اور پڑوسی رہا ہے ان کے ساتھ اس کا معاملہ کیسا رہا ہے اور اس کے باب میں ان کی شہادت کیا رہی ہے یا کیا ہے۔ اگر اس اعتبار سے اس کا ریکارڈ اچھا ہے تو لاریب وہ بہترین ساتھی اور بہترین پڑوسی ہے اور اگر یہ چیز موجود نہیں ہے تو اس کی مدح سرائی میں آسمان و زمین کے قلابے ملانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آدمی اپنے تعلقات و معاملات

[1] جامع الترمذی: کتاب البر والصلۃ، باب ۲۸

سے پہچانا جاتا ہے۔ جو اس کسوٹی پر نہیں پرکھا گیا اس کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جو اپنوں کے حقوق ادا کرنے میں ناکام رہا اس نے اگر دوسروں کے لیے فیض کے دریا بھی جاری کیے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھیے کہ ایک اچھے پڑوسی کے رویہ میں اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا سابقہ اچھے پڑوسیوں سے رہا ہے یا برے پڑوسیوں سے۔ اس کے پڑوسی اچھے ہوں جب بھی وہ اچھا رہتا ہے اور برے ہوں جب بھی وہ اچھا رہتا ہے۔ اس کی بہترین مثال خود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مکی زندگی کے دور میں آپ بدترین پڑوسیوں کے نرغہ میں رہے، لیکن ان برے پڑوسیوں نے بھی آپ کے بہترین پڑوسی ہونے کی شہادت دی اور علی رؤس الاشہاد اعتراف کیا کہ آپ بہترین ساتھی اور بہترین پڑوسی ہیں۔

منفی پہلو سے اصولی تلقین :

عن ابی شریح ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: واللہ لا یومن! واللہ لا یومن! واللہ لا یومن! قیل: ومن، یارسول اللہ؟ قال: الذی لا یامن جارہ بوائقہ[1]۔

ابو شریح سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم، وہ شخص ایمان نہیں رکھتا؛ خدا کی قسم، وہ شخص ایمان نہیں رکھتا؛ خدا کی قسم وہ شخص ایمان نہیں رکھتا؛ سوال کیا گیا کہ کون یارسول اللہ؟ ارشاد ہوا: وہ جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی مامون نہ ہو۔

اسی طرح منفی پہلو سے بھی ایسی جامع ہدایتیں اس باب میں حضورؐ نے دی ہیں جو ہماری رہنمائی کے لیے بالکل کافی ہیں۔ مثلاً:

سب سے پہلے اس کلام کے تیور پر غور فرمایئے۔ آپؐ ایک بار نہیں، بلکہ تین بار، اعادۂ قسم کے ساتھ، فرماتے ہیں کہ وہ شخص ایمان نہیں رکھتا، ایمان نہیں رکھتا، ایمان نہیں رکھتا! غور کیجیے کہ کتنی اہم اور ہولناک خبر ہے! اس کو سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے، لیکن آپؐ نے اس کی وضاحت اس وقت تک نہیں فرمائی جب تک لوگوں نے سوال نہیں کیا کہ ایسا محروم الایمان کون ہے، یارسول اللہ جس کے ایمان کی اس شدت کے ساتھ نفی فرمائی جا رہی ہے! ظاہر ہے کہ یہ طریقہ آپؐ نے اس لیے اختیار فرمایا کہ ہر شخص

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الادب، باب ۲۹

اس بات کو سنے اور کان کھول کر سنے۔

اس کے بعد اس بات پر غور فرمایئے کہ آپؐ ایمان کے لیے اس تاکید کے ساتھ صرف اس شرط کو ضروری نہیں قرار دیتے کہ ایک مومن کے پڑوسی اس کی ایذا اور تعدی سے محفوظ رہیں، جیسا کہ بعض روایات میں یہ بات بیان ہوئی بھی ہے، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ اس کے پڑوسی اس کی طرف سے ہر اندیشہ سے بالکل بےخطر رہیں۔ یہ بات صرف اس شکل میں ممکن ہے جب انہوں نے ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں تجربہ کر کے اس کی شرافت و فتوت اور اس کی کریم النفسی اور حق شناسی کا ایسا تجربہ کر لیا ہو کہ انہیں یہ پورا اطمینان ہو کہ خواہ کچھ ہی ہو جائے، لیکن اس شخص کو کوئی خوف اور کوئی طمع اس کے ادائے فرض سے روک نہیں سکتی۔ اگر کوئی امتحان پیش آ گیا تو یہ اپنی جان تو قربان کر دے گا، لیکن اپنی فتوت پر آنچ نہیں آنے دے گا۔

یہاں یہ امر بھی پیش نظر رکھیے کہ پڑوسی چونکہ ہر وقت کا ساتھی ہے اس وجہ سے اطمینان یا بے اطمینانی پیدا کرنے میں جو حصہ اس کا ہو سکتا ہے کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر نقصان پہنچانا چاہے تو آپ کی ہر غفلت اور ہر کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر آپ کی مدد کرنا چاہے تو وہ گویا آپ کی آنکھ، آپ کا کان اور آپ کا اپنا دست و بازو ہے۔ دور والے اگرچہ کوئی بڑی سے بڑی مدد پہنچا سکنے کی پوزیشن میں بھی ہوں، لیکن وہ اچھے پڑوسی کے نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ آدمی کو بسا اوقات اپنے جان و مال سے زیادہ اپنے عزت و ناموس کے لیے فکرمند ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جس میں ایک شریف پڑوسی سے جس طرح بڑی سے بڑی مدد مل سکتی ہے اسی طرح ایک کمینہ پڑوسی سے بڑے سے بڑا خطرہ بھی پہنچ سکتا ہے۔

تاریخ وسیر
امین احسن اصلاحی

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بحیثیت تاریخ ساز مدبّر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے جو دین بھیجا وہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے، اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ جس طرح وہ عبادات کے طریقے بتاتا ہے، اسی طرح وہ سیاست کے آئین بھی سکھاتا ہے، اور جتنا تعلق اس کا مسجد سے ہے، اتنا ہی تعلق اس کا حکومت سے بھی ہے۔ اس دین کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا اور سکھایا بھی اور ایک وسیع ملک کے اندر اس کو عملاً جاری و نافذ بھی کر دیا۔ اس وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکّی نفوس اور ایک معلمِ اخلاق کے ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ ہے اسی طرح بحیثیت ایک ماہرِ سیاست اور مدبّرِ کامل کے بھی اسوہ اور مثال ہے۔

اس امرِ واقعی سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پست حال قوم تھی۔ مشہور مورخ، علامہ ابن خلدون نے تو ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو، تاہم اس حقیقت سے تو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اہلِ عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہیں ہوئے، بلکہ ہمیشہ ان پر نزاع اور نارکی کا تسلط رہا۔ پوری قوم جنگجو اور باہم نبرد آزما قبائل کا مجموعہ تھی جس کی ساری قوت و صلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لوٹ مار میں برباد ہوتی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعورِ قومیت اور حکم و اطاعت وغیرہ جیسی چیزیں جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں، ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج نزاع پسندی کے لیے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امرِ محال بن چکا تھا۔ خود قرآن نے ان کو "قَوْمًا لُّدًّا" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا ہے:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا	زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر ڈالتے تو بھی ان

مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ	کے دلوں کو باہم نہ جوڑ سکتے۔

(الانفال – ۸ : ۶۳)

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس سال کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بنیانِ مرصوص بن گئی۔ یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہو گئی، بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسبابِ نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دور ہو گئے۔ یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی، بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہو گئی۔ یہ صرف خود ہی منظم نہیں ہو گئی، بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا اور اس کے اندر حکم و اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ابھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں، بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتربانی کے مقام سے جہانبانی کے مقام پر پہنچ گئی اور اس نے بلا استثناء دنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست اور جہانبانی کا درس دیا۔

اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی۔ اس کے پیدا کرنے میں حضورؐ نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصبات سے کوئی فائدہ اٹھایا، نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام لیا، نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دیا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دنیا میں جتنے بھی چھوٹے اور بڑے مدبّر اور سیاست دان گزرے ہیں، انہوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انہی محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضورؐ بھی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے تو یہ بات آپ کی قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی۔ لیکن آپؐ نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ ان میں سے ہر چیز کو فتنہ قرار دیا اور ہر فتنے کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔ آپ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالمگیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلائے کلمۃ اللہ اور خوفِ آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے۔ اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا، بلکہ ایک بہترین امت ظہور میں آئی جس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ	مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو،
عَنِ الْمُنْكَرِ	منکر سے روکتے ہو۔

(آل عمران – ۳ : ۱۱۰)

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبّر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جن اصولوں کے داعی بن کر اُٹھے

اگرچہ وہ، جیساکہ میں نے عرض کیا، فرد، معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطے میں آتا تھا، لیکن آپؐ نے کسی اصول کے معاملے میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی؛ نہ دشمن کے مقابل میں نہ دوست کے مقابل میں۔ آپؐ کو سخت سے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا، ایسے سخت حالات سے کہ کوئی بھی ہوتا تو ان کے مقابل میں نرم پڑجاتا، لیکن آپؐ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے کسی سختی سے دب کر کسی اصول کے معاملے میں کوئی سمجھوتا گوارا نہیں کیا۔ اسی طرح آپؐ کے سامنے پیش کشیں بھی کی گئیں اور آپؐ کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی مصلحتیں بھی سمجھانے کی کوشش کی گئی، لیکن ان چیزوں میں سے کوئی چیز آپؐ کو متاثر یا مرعوب نہ کرسکی۔ چنانچہ آپؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قائم تھی۔ دنیا کے مدبروں اور سیاست دانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاست دان کا نشان آپ نہیں دے سکتے۔ جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہوسکا ہو کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس نے اپنے کسی اصول کے معاملے میں کمزوری نہیں دکھائی یا ٹھوکریں نہیں کھائیں۔ لیکن حضورؐ نے ایک پورا نظامِ زندگی کھڑا کردیا، جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرین سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضورؐ کو نعوذ باللہ دیوانہ کہتے تھے۔ لیکن حضورؐ نے اس نظامِ زندگی کو عملاً دنیا میں برپا کرکے ثابت کردیا کہ جو لوگ آپؐ کو دیوانہ سمجھتے تھے، خود دیوانے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ حضورؐ نے کسی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی، بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کے لیے بھی اپنے اصول کی قربانی نہیں دی۔ اصولوں کے لیے جان اور مال اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی۔ ہر طرح کے خطرات برداشت کیے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کیے گئے، لیکن اصول کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف خاص مدت کے لیے تھی تو اس کا معاملہ اور تھا۔ وہ اپنی مدت پوری کرچکنے کے بعد ختم ہوگئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی، لیکن باقی رہنے والی چیزیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ آپؐ کو اپنی زندگی میں یہ کہنے کی نوبت نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی، لیکن اب حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ پر فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کرلی جائے۔

حضورؐ کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپؐ نے سیاست کو عبادت کی طرح، ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح، بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں، جو شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولے، چالبازیاں کرے، بدعہدیاں کرے، لوگوں کو فریب دے، یا ان

کے حقوق غصب کرے تو اگرچہ اس زمانے میں اقدار اور پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں، تاہم اخلاق بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھہراتا ہے اور قانون بھی ان باتوں کو جرم قرار دیتا ہے، لیکن اگر ایک سیاست دان اور ایک مدبر یہی سارے کام کرے تو یہ اس کے فضائل و کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس کی تعریفیں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد اپنے انہی کمالات کی بنا پر وہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کے لیے یہی اوصاف و کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو لوگ ان باتوں میں شاطر ہوتے، وہی لوگ ابھر کر قیادت کے مقامات پر آتے تھے۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمان داری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے، اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لوازم میں سے بھی ہے۔ بلکہ آپؐ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابلے میں ایک صاحبِ اقتدار اور بادشاہ کے جھوٹ کو، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، کہیں زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ آپؐ کی پوری سیاسی زندگی ہمارے سامنے ہے۔

اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپ کو پیش آئے جن کے پیش آنے کی ایک سیاسی زندگی میں توقع کی جاسکتی ہے۔ آپؐ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ آپؐ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپ کو حریفوں اور حلیفوں، دونوں سے مختلف قسم کے سیاسی اور اقتصادی معاہدے کرنے پڑے۔ دشمنوں سے متعدد جنگیں کرنی پڑیں۔ عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے۔ قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے۔ آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفتگوئیں کرنی پڑیں۔ اور سیاسی گفتگوؤں کے لیے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے۔ بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے۔ یہ سارے کام آپؐ نے انجام دیے، لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپؐ نے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا، کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالات میں بھی انصاف کیا۔ اگر آپ دنیا کے مدبرین اور اہل سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں تو میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی سی دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضورؐ کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ اب اس چیز کو چاہے تدبر سے تعبیر کیجیے یا حکمتِ نبوت سے۔

حضورؐ کی سیاست، حضورؐ کے تدبر کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ آپؐ نے عرب جیسے ملک کے ایک ایک

گوشے میں امن وعدل کی حکومت قائم کردی۔ کفار ومشرکین کا زور آپ نے اس طرح توڑا کہ فتح مکہ کے موقع پر تو انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپ نے خاتمہ کردیا۔ رومیوں کی سرکوبی کے لیے بھی آپؐ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپؐ نے کرڈالے، لیکن اس سارے کام کے اندر انسانی خون بہت کم بہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی تاریخ بھی شہادت دیتی ہے، اور آج کے واقعات بھی شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے انقلاب میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہوجاتی ہیں اور مال واسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہو گی، جو اس ساری جدوجہد کے دوران حضورؐ کے ساتھیوں میں شہید ہوئے، یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں قتل ہوئے!

پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں، لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہوجاتی ہیں۔ اس تہذیب و تمدن کے زمانے میں ہم نے دیکھا ہے کہ فاتح ملک کی فوجوں نے مفتوح ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام کی نسلوں سے بھردی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ارباب سیاست اس صورت حال کو شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے اس کو ہر انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی کے ناموس پر دست درازی ہوئی ہو۔

اہل سیاست کے نئے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور ایک نظم قاہرہ کے تحت منظم کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی ہیبت قائم کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں میں سے ہیں۔ اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے تو سیاست کے جو تقاضے ہیں وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اسی طرح کے مقاصد کے پیش نظر جب وہ نکلتے ہیں تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں؛ جہاں وہ ظاہر ہوتے ہیں، ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں؛ جہاں وہ اترتے ہیں، ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جلسوں میں ان کے حضور میں ایڈریس پیش کیے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کرجاتے ہیں تو ان کے لیے قصر وایوان آراستہ کیے جاتے ہیں، ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں ان کے لیے بری وبحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کیے جاتے ہیں، جب کبھی وہ سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو سڑک دو سروں کے لیے بند کردی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کے بغیر کسی صاحب سیاست کا تصور نہ دوسرے لوگ ہی کرتے ہیں، اور نہ کوئی صاحب

سیاست ان لوازم سے الگ خود کو کوئی تصور کرتا ہے۔ لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہل سیاست سے الگ رہے۔ جب آپ اپنے صحابہ کرامؓ میں چلتے تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں، مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تو دو زانو ہوکر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں، اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اس تصور کی بنا پر، جو حضورؐ کے بارے میں اس کے ذہن میں رہا ہوگا، سامنے آیا تو حضورؐ کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپؐ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میری ماں بھی سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہوگا، اسی طرح سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا میں بھی ہوں—— نہ آپؐ کے لیے کوئی سواری تھی، نہ کوئی قصر وایوان، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپؐ جو لباس دن میں پہنتے اسی میں شب میں استراحت فرماتے، اور تمام اہم سیاسی امور کے فیصلے فرماتے۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ اس زمانے کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹ باٹ سے آشنا نہیں ہوئی تھی جس طمطراق اور جس ٹھاٹ باٹ کی اب وہ عادی ہوگئی ہے جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ سیاست اور اہل سیاست کی تانا شاہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔ فرق اگر ہوا ہے تو محض بعض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا، جس میں دنیوی کروفر کی بجائے خلافت الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹ باٹ کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا۔ لیکن اس سادگی، فقر اور درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم وشام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور آپ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپؐ نے اپنی حیات مبارکہ ہی میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کردی جو آپؐ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصل مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی وسیاسی زندگی میں اس کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لیے پوری طرح باخبر تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کرۂ ارض کے تین براعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جمالیں اور اس کی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لیے موزوں اشخاص ورجال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے جن تین براعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل آباد نہیں تھے۔ بلکہ

وقت کی نہایت ترقی یافتہ جبار و قہار شہنشاہیتیں تھیں۔ لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرۂ عرب سے اٹھ کر ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ کر پھینکا گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اور ان کے ظلم و جور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلا دیں، جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبرین اور اہلِ سیاست کی پوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجیے کہ ان میں کوئی شخص بھی ایسا نظر آتا ہے، جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو جو اس کے فکر و فلسفے اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے جن معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے عالم و عامل ہزاروں صحابہؓ تھے؟

آخر میں ایک بات بہ طور تنبیہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مرتبہ اور مقام یہ ہے کہ آپؐ نبی خاتم اور پیغمبرِ عالم ہیں۔ سیاست اور تدبر اس مرتبۂ بلند کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔ جس طرح ایک حکمران کی زندگی پر ایک تحصیلدار کی زندگی کے زاویے سے غور کرنا ایک بالکل ناموزوں بات ہے، اس سے زیادہ ناموزوں بات شاید یہ ہے کہ ہم سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک ماہر سیاست یا ایک مدبر کی زندگی کی حیثیت سے غور کریں۔ نبوت اور رسالت ایک عظیم عطیۂ الٰہی ہے۔ جب یہ عطیہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو بخشتا ہے تو وہ سب کچھ اسے بخش دیتا ہے، جو اس دنیا میں بخشا جا سکتا ہے۔ پھر حضورؐ تو صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ خاتم الانبیاء تھے؛ صرف رسول ہی نہیں تھے بلکہ سید الرسل تھے؛ صرف اہلِ عرب ہی کے لیے نہیں تھے بلکہ تمام عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے؛ اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت صرف کسی خاص مدت ہی کے لیے نہیں تھی، بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی تھی اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ حضورؐ کسی دینِ رہبانیت کے داعی بن کر نہیں آئے تھے، بلکہ ایک ایسے دین کے داعی تھے جو روح اور جسم، دونوں پر حاوی اور دنیا و آخرت، دونوں کی حسنات کا ضامن تھا۔ جس میں عبادت کے ساتھ سیاست، درویشی کے ساتھ حکمرانی کا جوڑ محض اتفاق سے پیدا نہیں ہو گیا تھا بلکہ یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ جب صورت حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا سیاست دان اور مدبر کون ہو سکتا ہے، لیکن یہ چیز آپؐ کا اصلی کمال نہیں، بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، آپؐ کے فضائل و کمالات کا محض ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔

افاداتِ فراہی

خالد مسعود

تخلیق اور اس کی غایت

تخلیق کے فعل کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک مادہ کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا، دوسرا ایک شے کو دوسری شے میں بدل دینا۔ جہاں تک ایجاد کا تعلق ہے یہ سمجھ میں تو آجاتی ہے لیکن اس کی کیفیت کو جاننا مشکل ہے۔ بدلنے کا عمل محکم تدبیر، مضبوط حساب اور شے کے دقیق ترین اجزا میں حرکت پیدا کرنے پر مشتمل ہے۔ ایجاد کرنا اور بدلنا دونوں عجیب کام ہیں اور بدلنا بھی کسی طرح ایجاد سے کم نہیں کیونکہ یہ عمل فنا اور ایجاد دونوں پر حاوی ہے۔ مثال کے طور پر حرکت کو روشنی اور برق میں بدل دینا یا مٹی کو روغن، چینی، گوشت، ہڈی، پھلوں، پھولوں اور زندہ اجسام میں بدلنا نہایت ہی عجیب اور باریک کاموں میں سے ہے۔ ملحدین مادہ کے بغیر ایجاد کا انکار کرتے ہیں، لیکن ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ وہ صرف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بات ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ اسی طرح وہ بدلنے کے عمل کو طبعی قوتوں سے منسوب کرتے ہیں چونکہ یہ عمل ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اس لیے ان کے پاس اسے طبعی قوتوں سے منسوب کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ مگر یہاں آکر رک جاتے ہیں حالانکہ ہر کام جس میں حکمت، تدبیر اور منفعت ہو لازماً کسی حکیم، ارادہ رکھنے والے، قادر اور رحیم کی طرف سے ہوتا ہے اور طبعی قوتوں کی یہ کیفیت نہیں۔ مزید غور کیجیے تو اس دنیا میں ایک ایسی حکمت بھی جاری ہے جو اس کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منظم کرتی ہے اور اس طرح توحید کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ یہاں بھی ملحدین حیران ہو جاتے ہیں اور تخلیق کی نسبت ایک بڑی قوت کی طرف کر دیتے ہیں مگر اس خیال کے ساتھ کہ یہ قوت علم و ارادہ سے خالی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ صاحب حمد اور صاحب حسن ہے، اس کی صفت کا یہ تقاضا ہوا کہ انعام کرے لہٰذا اس نے خلق کو پیدا کیا اور اس پر اتنا انعام کیا جس کی حد نہیں۔ پس تخلیق کی علتِ ارادی رحمت کے سوا کچھ نہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم[1]

---

[1] تخلیق میں نے اپنی کسی منفعت کے لیے نہیں بلکہ بندوں پر بخشش کرنے کے لیے کی ہے۔

یہ قول بہت عمدہ، حکیمانہ اور عقل و وحی کے مطابق ہے۔ اگر خدا کسی دوسرے سبب سے مخلوقات کو پیدا کرتا تو یہ کارِ عبث ہوتا کیونکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ مخلوقات وجود میں آنے سے پہلے معدوم تھیں اس لیے ان کا اپنا کوئی تقاضا بھی نہ تھا۔ محض قوت کی صفت کے اندر بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بدولت تخلیق لازم آتی ہو ورنہ باری تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر محض اپنے زور سے ہی خلق وجود میں آتی رہتی اور خدا کا خالق ہونا باطل ہو جاتا۔ یہ حقیقت ہندو فلاسفہ سے مخفی رہی ہے اس لیے صفاتِ رب کے سلسلہ کی دوسری ضلالتوں کے علاوہ وہ فلسفۂ تخلیق میں بھی گمراہ ہو گئے۔ اس معاملہ میں مذکورہ حقیقت کو مضبوطی سے تھامنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے تمام امر کا سبب اس کی رحمت ہی کو سمجھنا چاہیے۔

جس طرح خلق اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار میں سے ہے اسی طرح شریعت بھی اس کی رحمت ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ بھی خلق ہی کی بھلائی کے لیے ہے۔ جنوں اور انسانوں کے سوا دوسری مخلوق کے لیے شریعت ان کا فطری الہام اور خدا کے فرشتوں کا تصرف ہے۔ رہا جن و انس کا سوال تو خدا نے ان کو تمیز عطا کی اور ابتلا میں ڈالا تاکہ درجۂ حمد کے مستحق ہو سکیں۔ یہ درجہ عقل و ارادہ کو عمل میں لائے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں۔ ہم پھول کو سونگھ کر خالق کی حمد کرتے ہیں اور عجائبِ قدرت دیکھ کر اللہ کی تسبیح کرتے ہیں لیکن جب معاملہ انسان کا ہوتا ہے تو ہم اس کے فعل کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنے فعل کا خود ارادہ کرنے والا ہے۔ یہ درجہ بہت ہی بلند اور انسان کے لیے سب سے بڑا انعام ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی ردائے حمد میں سے ایک خلعت انسان کو بھی عطا کر دی ہے۔ جو شخص اس خلعت سے مشرف ہوتا ہے اللہ اس کے فرشتے اور انسان اس کی تعریف کرتے ہیں۔ جو شخص خود اپنی تعریف کرے اور فخر کرے وہ گویا یہ خلعت چھین کر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس معاملے میں پسندیدہ چیز عاجزی، تواضع اور اللہ کے احسان کا اعتراف ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی بدولت دوسری تمام مخلوقات کی نسبت جن و انس پر عبودیت اور اس احسان کا اعتراف واجب ہے۔ یہ دونوں اپنے اس گمان کی بدولت کہ یہ مستقلاً قدرت رکھنے والے اور محمود ہیں، کفر و شرک کے بالکل کنارے پر تھے تو خدا نے ان کو صحیح راہ سجھائی۔ اس نے ارادہ اور عقل عطا کی اور نیکی بدی کا رستہ الہام کیا۔

قرآن مجید اور دوسری مقدس کتابوں میں متعدد آیات اس پر دلیل ہیں کہ شریعت کا مدار رحمت اور ہمدردی پر ہے اور یہی تخلیق کی بنیاد بھی ہے۔ اسی حقیقت کو ہمارے سامنے مستحضر رکھنے کے لیے خدا نے اپنے ناموں — اللہ، رحمان اور رحیم — کو شروع میں رکھا، سورہ الحمد سے اپنی کتاب کا آغاز کیا اور اپنے اسمار میں سے بیشتر اسمار اسی اصل سے لیے مثلاً رؤف، ودود، حنان، منان، مومن، وکیل، صمد، مولیٰ اور نصیر وغیرہ۔

تالیفاتِ امام حمیدالدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیرِ فراہی :	۶۰ — ۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵ — ۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵ — ۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۷۲۰ — ۰۰
فی جلد :	۸۰ — ۰۰
۲۔ مبادیٔ تدبرِ قرآن :	۱۶ — ۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۲ — ۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰ — ۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶ — ۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳ — ۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸ — ۰۰
۸۔ توضیحات :	۱۲ — ۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اوّل	۲۷ — ۰۰
جلد دوم	(زیرِ طبع)
۱۰۔ اصولِ تدبرِ حدیث :	(〃)
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار :	(〃)
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(〃)
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید :	(〃)
۱۴۔ حقیقتِ نماز :	(〃)
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ :	(〃)

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور-۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹